جلد 6 شمارہ 9 نومبر 2004ء رمضان 1425ھ

قد افلح من تزکّٰی ○ وذکر اسم ربّہٖ فصلّٰی ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا

اللہ

محبت

صداقت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاح آدمیت

گوجرانوالہ

Registerd

CPL No. 4

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

اغراض و مقاصد

- کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول ﷺ، کثرت ذکر، مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم و فروغ دینا۔
- کشف و کرامات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قرب و عرفان اور اسکی رضا و لقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا۔
- حضور ﷺ کے صحابہ کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج۔
موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت ہی مختصر اور سہل العمل اوراد و اذکار کی تلقین۔
- غصہ و نفرت، حسد و بغض، تجسس و غیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم و رضا، عالمگیر محبت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل و عیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا۔
- اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محبت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے انکے اخلاق کی اصلاح کرنا۔

عالمگیر محبت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا علمبردار

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

بیادگار **خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ**
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ماہنامہ گوجرانوالہ

فلاحِ آدمیت

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

جلد 6 شمارہ 9 نومبر 2004ء رمضان 1425ھ

یمت ———— 20/- روپے
سالانہ فنڈ ———— 200/- روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:0431-862835
Mob: 0320-5793520

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:0431-881379

عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

اداریہ

رمضان کا روزہ اسلام کا تیسرا اہم رکن ہے، قرآن میں نہ صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ رمضان کے روزے رکھو بلکہ اس کے آداب و احکام بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اور رمضان کی عظمت و برکت کی وجوہ پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ قرآن میں رمضان کی عظمت اور فضیلت کے تین وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ نزول قرآن یعنی اس مہینے قرآن پاک نازل ہوا۔

۲۔ لیلۃ القدر یعنی اس مہینے میں ایک رات ایسی مبارک ہے کہ وہ خیر و برکت میں ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

۳۔ فرضیت صوم، یعنی اس مہینے میں روزے فرض کئے گئے۔

انہی فضائل کی بنا پر نبی ﷺ نے اس کو شہر اللہ (اللہ کا مہینہ) کہہ کر خدا کی طرف نسبت کا شرف بخشا ہے اور اس کو تمام مہینوں سے افضل قرار دیا ہے۔ ذیل میں ان وجوہ کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

فضیلت رمضان کے وجوہ۔

۱۔ نزول قرآن، قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

"رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو سارے انسانوں کے لئے ہدایت ہے، جو راہ حق دکھانے والی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے، اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی کتاب ہے"۔

رمضان کی عظمت و فضیلت کے لئے صرف یہ بات کیا کم ہے کہ اس میں خدا نے انسان کی ہدایت کی آخری کتاب نازل فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسانیت سرچشمہ ہدایت سے محروم ہوتی تو یہ پورا کارخانہ ہستی سورج کی تابناکی اور چاند تاروں کی دلآویز روشنیوں کے باوجود تیرہ و تار ہوتا، اور ساری صناعی اور حسن و جمال کے باوجود کائنات نہ صرف بے رونق بلکہ نامکمل اور بے مقصد ہوتی، اور کفر والحاد اور شرک و معصیت میں بھٹکے ہوئے انسان جنگل کے درندوں سے زیادہ

بدتر ہوتے۔ قرآن اس سرزمین پر ہدایت اور روشنی کا ایک ہی سرچشمہ ہے جو اس سے محروم ہے وہ یقیناً ہدایت اور خیر سے محروم ہے۔

۲۔ لیلۃ القدر:۔ قرآن پاک میں صراحت ہے کہ قرآن رمضان میں نازل کیا گیا، اور یہ کہ لیلۃ القدر میں نازل کیا گیا ہے۔

"ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس میں فرشتے روح الامین اپنے رب کے حکم سے ہر ایک کام کے انتظام کے لئے اترتے ہیں۔ سلامتی ہی سلامتی یہاں تک کہ صبح ہو جائے"۔ (القدر)

اس کے لازمی یہ معنی ہیں کہ لیلۃ القدر رمضان ہی کی کوئی رات ہے، اور حدیث میں وضاحت ہے۔ "اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے"

اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو"

۳۔ فرضیت صوم، خدا نے روزہ جیسی اہم عبادت کے لئے اس مہینے کو مقرر فرمایا اور اس مہینے کے روزے مسلمانوں پر فرض کئے قرآن میں ہے۔

"پس جو شخص بھی تم میں سے اس مہینے کو پائے اس پر لازم ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے"

اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے انوار و برکات سے ہم سب کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے

آمین

والسلام

وحید احمد

دو دفعہ جینا دو دفعہ مرنا

محمد صدیق ڈار توحیدی

بائبل میں کتاب پیدائش کے پہلے باب کی ابتداء ان آیات سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں زمین و آسمان پیدا فرمائے۔ ابھی زمین کی ہیئت درست نہیں ہوئی تھی اور ہر سو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''روشنی ہو'' تو روشنی ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے روشنی اور اندھیرے کو علیحدہ علیحدہ کر دیا اور یوں دن اور رات وجود میں آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اندھیرا پہلے تھا اور روشنی کا ظہور بعد میں ہوا۔ اسلامی تقویم یعنی قمری کیلنڈر میں ہم چوبیس گھنٹے کے یوم کی ابتداء شام ہی سے کرتے ہیں اور رات گذرنے کے بعد دن آتا ہے۔ عام طور پر اندھیرے کو موت اور روشنی کو زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور رات کی نیند کو موت کے مشابہ گردانا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی موت کا ذکر حیات سے پہلے آتا ہے اور کئی مقامات پر اسی ترتیب کو قائم رکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے سورۃ الملک کی ابتدائی آیات ملاحظہ فرمائیں:

ترجمہ: ''پاک ہے وہ ذات جس کے دست قدرت میں حکمرانی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی ہے جس نے موت اور حیات کو خلق فرمایا تاکہ تمہیں آزمائے کہ کون اچھے اعمال سرانجام دیتا ہے اور وہ زبردست اور بخشنے والا ہے''۔

اس آیت مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت اور حیات کو ہماری آزمائش کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ یہ دونوں اس کی مخلوق ہیں۔ معلوم ہوا کہ حیات کی طرح موت کا بھی ایک عالم یا جہان ہے جس سے ہر ایک کو واسطہ پڑتا ہے۔ ان عوالم سے انسان کس طرح اور کتنی مرتبہ گذرتا ہے اس کے بارے میں قرآن کریم میں جو واضح اشارات دیئے گئے ہیں ہم ان پر غور کریں گے۔ زندگی اور موت کے بارے میں جو تصور یا خیال ہم نے اپنے ذہنوں میں قائم کر رکھا ہے اسے تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر دیں اور پھر قرآن کریم کے شروع میں ہی آنے والی مندرجہ ذیل آیت کے معانی پر غور فرمائیں تاکہ موت اور حیات کی اصل حقیقت واضح ہو جائے۔

ترجمہ: ''تم اللہ کی ہستی سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو۔ جب تم اموات یعنی بے جان تھے تو اس

نے تمہیں حیات یعنی زندگی دی ہے۔ وہ پھر تمہیں موت دیگا پھر وہی تم کو زندہ کرے گا پھر اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے''۔

یہاں صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ انسان کی ابتداء حیات ارضی سے نہیں ہوئی بلکہ اس سے پہلے اس کا وجود ''عالم موت'' میں تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے حیات عطا فرمائی۔

وکنتم امواتاً ''اور تم تھے مردہ یا اموات'' ظاہر کر رہا ہے کہ تمہارا ایک وجود تھا جسے اللہ عالم حیات میں لایا وہ پھر اسے عالم موت میں لے جائے گا اور دوبارہ عالم حیات میں لائے گا۔ اس آیت ہی سے یہ حقیقت ظاہر ہوگئی کہ پہلے موت کا جہان ہے پھر حیات ارضی کا جہان ہے اس کے بعد پھر موت کا جہان ہے اور پھر دوبارہ حیات آخرت کا جہان ہے۔ گویا ہر انسان عام فہم زبان میں دو دفعہ مرتا ہے اور دو دفعہ جیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں مزید آیات قرآنی ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ ان آیات کی روشنی میں شہدائے کرام کی خصوصی حیات کا مسئلہ بھی اجاگر ہوگا جن کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

☆ ''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ ''اموات'' یعنی مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے''۔ **(البقرہ۔154)**

☆ ''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو ''اموات'' یعنی مرے ہوئے نہ سمجھنا بلکہ وہ اللہ کے ہاں زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے''۔ **(آل عمران۔169)**

حالانکہ بظاہر وہ ہماری نظروں میں مر جاتے ہیں۔ ان کے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور ہم ان کی نماز جنازہ پڑھ کر بصد اکرام قبروں میں دفن کر دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ان دونوں آیات میں جو خصوصی احکام دیئے گئے ہیں وہ صرف ان خوش نصیبوں اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے دیوانوں کے لئے ہیں جو اس کی راہ میں قتل کئے گئے۔ دونوں جگہ **من یقتل فی سبیل اللہ** آیا ہے۔

موت اور حیات کے مراحل کو سمجھنے کے لئے علماء اور صوفیا، تدبر و تفکر کرتے چلے آئے ہیں تا کہ یہ حقیقت آشکارا ہو سکے کہ انسان کی روح کن کن مراحل سے گزر کر رحم مادر میں پہنچتی ہے؟

...ارضی کے دوران انسان سے سرزد ہونے والے اعمال اسے کس طرح متاثر کرتے ہیں اور ... کے بعد قیامت تک کا جو عرصہ ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ حضرت ... عبدالحکیم انصاریؒ نے ''تعمیر ملت'' میں روحانی عالم کے عنوان کے تحت روح کے سفر کی بابت ... پر تحریر فرمایا ہے اس کا مطالعہ اہل ذوق حضرات کو ضرور کرنا چاہیے۔ اس تحریر کے ایک حصے کا ... یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روز ازل تمام ارواح پیدا کر دی تھیں۔ ان کے مخزن کو روح بسیط یا ... اعظم کہتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی روح کو دنیا میں بھیجنے کا ارادہ فرماتا ہے تو وہ ایک شعاع ... صورت میں عالم اسفل کی طرف نزول کا سفر شروع کر دیتی ہے۔ وہ پہلے عقل بسیط سے بقدر ... استعداد عقل اور پھر نفس بسیط سے مقدور بھر نفس کا حصہ لیتی ہے۔ پھر عالم امر اور عالم مثال کے ... طبقات سے گزرتی ہوئی ناسوت طے کر کے اثیر میں داخل ہو جاتی ہے جو کہ مادے کی آخری ... لطیف ترین حد ہے۔ اثیر سے یہ حواس پنجگانہ اور دیگر مادی خواص ،قویٰ کو بقدر استعداد اخذ ... کرتی ہوئی مخصوص نظام شمسی کے آفتاب میں جاتی ہے اور اسی میں جان یا روح حیوانی کی حرارت ... حاصل کر کے اس کرے میں پہنچ جاتی ہے جہاں اس کو پیدا ہونا ہے۔ اب وہ یہ انتظام قضاوقدر کسی ... ہونے کی چیز مثلاً غلہ یا پھل وغیرہ میں داخل کی جاتی ہے اور وہ چیز اس شخص کو کھلائی جاتی ہے جو ... اس کا باپ بننے والا ہے۔ صلب پدر سے پھر یہ رحم مادر میں منتقل ہوتی ہے اور وہاں نو ماہ مادی جسم کی ... تعمیر میں بسر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد روح پیکر مادی پہن کر عالم مادی میں جلوہ افروز ہوتی ہے ... ارضی زندگی گزارے۔

اب تک دو عالموں کا سفر بیان ہوا ہے۔ ایک میں انسان کی روح موجود تھی لیکن جسم کے بغیر ... تھی۔ اور دوسرے جہان کے سفر کا آغاز مادی جسم کے ساتھ ہوتا ہے جسے ہم حیات یا زندگی کے ... نام سے جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے محولہ بالا آیت کے یہ معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ جب روح جسم ... کے بغیر ہوتی ہے تو وہ عالم موت میں ہوتی ہے اور ہم اسے مردہ یا اموات کہتے ہیں اور جب وہ ... مادی جسم کے ساتھ جلوہ افروز ہوتی ہے تو اسے ہم زندہ کہتے ہیں۔ اسی طرح جب حیات ارضی کے ... اختتام پر روح اپنے مادی جسم سے علیحدہ ہو کر عالم مثال یا عالم برزخ میں چلی جاتی ہے تو اس

مرحلے کو پھر ہم موت کا نام دیتے ہیں۔ اور قیامت کے دن جب تمام روحیں دوبارہ مادی جسموں کے ساتھ ظاہر ہونگی تو اسے پھر زندگی یا حیات کا نام دیا جائے گا اور یہ حیات آخرت ہوگی۔ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر بھی ان مراحل موت و حیات کو بیان کیا گیا ہے۔

وھو الذی احیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم۔ ان الانسان لکفورo (الحج۔66)

ترجمہ: ''اور وہی تو ہے جس نے تمہیں حیات بخشی پھر تمہیں موت دیتا ہے پھر تمہیں زندہ بھی کرے گا۔ اور انسان بڑا ناشکرا ہے''۔

قرآن کریم میں بیان کئے گئے حقائق کے مطابق پہلی منزل موت کی ہے جس میں روح بغیر جسم کے ہے پھر حیات ارضی ہے جس میں روح مادی جسم کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ تیسری منزل پھر موت کی ہے اور روح جسم کے بغیر عالم برزخ میں قیام کرتی ہے اور اس کے بعد دوبارہ حیات ہے اور روح کو پھر جسم عطا کیا جائے گا۔ ان منازل اور دو دفعہ مرنے اور دو دفعہ جینے کا اقرار قیامت کے دن کفار ان الفاظ سے کریں گے۔

قالوا ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین فاعترفنا بذنوبنا فھل الیٰ خروج من سبیلo (المومن۔11)

ترجمہ: ''کفار کہیں گے کہ اے ہمارے رب تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ زندگی بخشی۔ ہم کو اپنے گناہوں کا اعتراف ہے تو کیا نکلنے کی کوئی سبیل ہے''۔

موت و حیات کی حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد یہ بات بھی جان لیں کہ روح انسانی جب جسم کے بغیر عالم موت میں ہوتی ہے تو اسے رزق کی ضرورت نہیں ہوتی اور جب وہ جسم کے ساتھ ہوگی تو پھر رزق اس کی ضرورت ہے۔ وہ چاہے شکم مادر میں ہو، حیات ارضی میں ہو یا حیات آخرت میں۔ یہاں تک کہ دوزخیوں کو بھی خوراک دی جائے گی چاہے وہ زقوم، ناگ پھنی، کانٹے دار جھاڑیوں، گرم پانی اور زخموں کے دھوون کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ البتہ ملائکہ اگر انسانی صورت میں کبھی آئیں جیسا کہ قرآن سے ثابت ہے تو انہیں مادی رزق کی حاجت نہیں

ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشری لباس میں آنے والے فرشتوں نے ان کی طرف سے پیش کردہ طعام کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ اس کے برعکس حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کے غلط عقیدہ یعنی ان کی مزعومہ الوہیت کی تردید کر کے ان کی بشریت کو ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل قرآن میں دی گئی ہے کہ **کانا یاکلان الطعام** وہ دونوں تو کھانا کھاتے تھے۔ کیونکہ طعام انسانی جسم کی ضرورت ہے اس لئے وہ دونوں بھی بشر اور انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کتنی مختصر، سادہ اور دل میں اتر جانے والی بات ارشاد فرمائی۔ اب شہدائے کرام کے بارے میں اپنی رائے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ ہم اس دنیا میں جو بھی اعمال کریں گے آخرت میں ہمیں ان کی سزا یا جزا ضرور ملے گی۔ سورۃ یاسین کی آیت نمبر 54 میں ارشاد ہوا ہے کہ ''آج کے دن کسی نفس پر ذرا برابر ظلم نہیں کیا جائے گا اور جیسے اعمال تم نے سرانجام دیئے ویسا ہی بدلہ تمہیں ملے گا''۔ یعنی جو سزا کا مستوجب ہوگا اس کو سزا اس کے اعمال کی نوعیت اور شدت کے مطابق ملے گی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی جزا کئی گنا بڑھا چڑھا کر دے گا لیکن اس کی نوعیت ان کے اعمال کے مطابق ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے مقبول اور مقرب بندے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت اور حیات آخرت کو ترجیح دی، اپنے نفسوں کو لگام دیئے رکھا، اپنی قوت ارادی سے ناجائز خواہشات کو توڑا، مادی لذات کی طرف لپکنے کی بجائے شیوہ تسلیم و رضا کو اپنایا اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کی تمام خواہشات کی تکمیل فرمائے گا۔ چنانچہ سورۃ واقعہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ انہیں وہ پھل دیئے جائیں گے جن کو وہ پسند کریں گے اور ان پرندوں کا گوشت کھانے کو ملے گا جن کی وہ خواہش کریں گے۔ جنہوں نے خواہشات قربان کیں ان کی خواہشات پوری کی جائیں گی۔ تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ سب سے بڑی قربانی دیتے اور اپنے محبوب اللہ کے قدموں میں اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کرتے ہیں ان کی جزا کیا ہوگی؟

''صلہ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ''۔ ان کی جزا یہی ہے کہ انہیں اس زندگی سے بھی بہتر زندگی سے نوازا جائے۔ اور یہ ہم جان ہی چکے ہیں کہ زندگی جسم کے ساتھ ہی مفہوم ہوتی ہے۔ حضور نبی

کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ شہداء کی روحیں جنت کے سبز پرندوں میں داخل کی جاتی ہیں یعنی اس خاکی جسم کی بجائے انہیں اس سے کہیں لطیف جسم عطا کیا جاتا ہے اور اسکے ساتھ وہ جہاں چاہے پرواز کرتے ہیں اور عرش الٰہی کے زیر سایہ قندیلوں میں انکا بسیرا ہوتا ہے۔ یہ مخصوص انعام اور مقام صرف ان کے لئے ہے جو اللہ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں۔ باقی تمام انسانوں کی روحیں عالم برزخ میں اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق قیام کرتی ہیں لیکن وہ بغیر جسم کے ہوتی ہیں اس لئے انہیں اموات کہا جاتا ہے۔ لیکن شہداء کو جسم عطا کر کے خصوصی زندگی سے نوازا جاتا ہے اس لئے فرمایا گیا کہ انہیں اموات یا مردہ ہرگز نہ سمجھو۔ کیونکہ ان کو جسم عطا کیا جاتا ہے اور جسم کی یہ ضرورت ہے کہ اسے رزق دیا جائے اسی لئے یہ واضح فرما دیا گیا ہے کہ ان کو کوئی خیالی یا روحانی جسم نہیں دیا گیا بلکہ وہ جسم ایسا ہے جسے رزق کی ضرورت ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ یہ شہداء کرام کی قربانی کی اللہ رحیم و کریم کی طرف سے جزاء کی خاص صورت ہے۔ اس سے شہداء کی اللہ کے مقربین پر کلی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں علیہم السلام، اصحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین اور مقربین بارگاہ الٰہی کے جو مقامات ہیں وہ خاص انہی کا حصہ ہیں۔ اس لئے ان ہستیوں کو زندہ ثابت کر کے شہید قرار دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں خاص خاص اعمال کا بدلہ اس طرح عطا کیا جائے گا کہ دوسرے اس پر رشک کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی ایسے ہی عزت والے بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین

دو روزے

مولانا ابوالحسن علی ندوی

(یہ تقریر 23 رمضان المبارک 1415ھ کو بعد نماز جمعہ مسجد شاہ علم اللہ تکیہ رائے بریلی میں کی گئی)

میرے بھائیو! سب سے پہلے تو آپ کو رمضان المبارک کی سعادت ملنے اور رمضان المبارک میں روزے رکھنے اور اس کام کے لئے توفیق الٰہی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ یہ معمولی نعمت نہیں ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بڑے وعدے فرمائے ہیں، اور اللہ کے رسول ﷺ نے بڑی بشارتیں سنائی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "**من صام رمضان ایماناً واحتساباً غفرله ماتقدم من ذنبه**" کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے، اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے اجر وثواب کی لالچ میں، تو اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ اور بظاہر آخری جمعہ ہے، جمعۃ الوداع ہے۔ اس کے بعد جو روزے باقی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو رکھنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور شب قدر کی دولت ونعمت بھی عطا فرمائے، ہماری اور آپ کی عاجزانہ دعاؤں کو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، جو اس مہینہ میں کی گئیں۔

اب میں آپ کے سامنے بظاہر ایک نئی بات کہنے والا ہوں، لیکن وہ نئی بات نہیں ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیم سے ماخوذ ہے اور قرآن مجید پر مبنی ہے لیکن بہت سے بھائیوں کے لئے نئی ہوگئی اور نئی چیز کی ذرا قدر ہوتی ہے اور اس سے آدمی کا ذہن ذرا تازہ، بیدار اور متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ نئی بات یہ ہے: "روزے دو طرح کے ہیں، ایک چھوٹا روزہ ایک بڑا روزہ"۔

چھوٹے روزے کی تحقیر مقصود نہیں، صرف زمانی اور وقتی لحاظ سے کہہ رہا ہوں۔ چھوٹا روزہ کتنا ہی بڑا ہو، ۱۳ گھنٹہ، ۱۴ گھنٹہ کا روزہ ہوگا بعض ملکوں میں جہاں دن اس زمانہ میں بڑا ہوتا ہے اس سے کچھ زیادہ۔ یہ وہ روزہ ہے جو بلوغ پر مسلمان پر فرض ہو جاتا ہے، وہ صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب تک قائم رہتا ہے۔ اس روزہ کا ایک قانونی ضابطہ اور اس کے کچھ شرعی احکام ہیں جو آپ کو معلوم ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس روزہ میں آدمی کھاپی نہیں سکتا اور ان تعلقات ومعاملات کا لطف نہیں حاصل کر سکتا جن کی اور دنوں میں اجازت ہے۔ یہ روزہ چاہے ۲۹ دن کا ہو یا ۳۰ دن کا، اس میں محدود پابندیاں ہیں۔ رمضان کے اس روزے سے لوگ واقف اور اس کے قوانین واحکام پر عامل ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ غور کریں کہ اس روزے کے علاوہ

اور کون سا روزہ ہے جو اپنے وقت اور رقبہ میں اس سے بڑا ہے گرمی کے روزے اور بڑے ہوتے ہیں اور اس روزے کے علاوہ اور کون سا بڑا روزہ ہوگا، کیا شش عید کا روزہ بتانے والا ہوں پندرھویں شعبان کا؟ کون سا روزہ بتانے والا ہوں۔

بڑا روزہ ہے ''اسلام کا روزہ'' اسلام خود ایک روزہ ہے اور یہ سب روزے اور عیدین بھی بلکہ روزہ، نماز یہاں تک جنت بھی، جو اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا۔ وہ سب اس کے طفیل ہی ہے۔ اصل بڑا روزہ اسلام کا روزہ ہے۔ وہ کب ختم ہوتا ہے کب شروع ہوتا ہے یہ بھی سن لیجئے۔

جو خوش قسمت انسان مسلمان گھر میں پیدا ہوا، اور وہ شروع سے کلمہ گو ہے اس پر بلوغ کے بعد ہی یہ طویل مسلسل روزہ فرض ہو جاتا ہے۔ اور جو اسلام لائے کلمہ پڑھے یہ روزہ اس پر اسلام قبول کرنے کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔

اور یہ روزہ کب ختم ہوگا یہ بھی سن لیجئے۔ رمضان کا روزہ اور نفلی روزہ تو غروب آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے، مگر اسلام کا یہ روزہ تو آفتاب عمر کے غروب ہونے پر ختم ہوگا۔

رمضان کے روزہ و نفلی روزہ کا افطار کیا ہے۔ آپ عمدہ سے عمدہ مشروب اور لذیذ سے لذیذ غذا سے افطار کر سکتے ہیں۔ زیادہ مشروبات اور ماکولات کا نام سن کر آپ کے منہ میں پانی آ جائے گا اور شوق پیدا ہو جائے گا، اس لئے میں ان کا نام نہیں لیتا۔ وہ روزہ زمزم سے کھلتا ہے، وہ روزہ ٹھنڈے پانی سے کھلتا ہے یا دوسرے مشروبات سے یا کھجور وغیرہ سے کھلتا ہے۔ اور زندگی کا یہ طویل و مسلسل روزہ کس سے کھلے گا؟ حضرت محمد رسول اللہ، محبوب رب العالمین، شفیع المذنبین سید المرسلین ﷺ کے دست مبارک سے جام طہور، جام کوثر سے کھلے گا۔ اگر وہ روزہ پکا ہے اور آپ نے اس روزے کی شرائط پورے کر دی ہیں اور محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل سے ہم دنیا سے کلمہ پڑھتے ہوئے گئے، ہماری روح اس حال میں نکلی کہ ہماری زبان پر کلمہ تھا اور ہم "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہہ رہے تھے، ہمارے دل میں نور ایمان تھا ہمارے دماغ میں اللہ سے ملاقات اور حضور ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کا شوق تھا تو وہ روزہ اس وقت ختم ہوتا ہے۔ اس کا افطار کیا ہے اس کی ضیافت کیا ہے؟ وہ ہے جس ضیافت پر آدمی اپنی جان دے دے.... اور اللہ کے بندوں نے جان دی ہے۔ سینکڑوں اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے اس شوق میں جان دی ہے، کہ اللہ کے رسول ﷺ کا دیدار نصیب ہو اللہ کے رسول

کے سامنے ہم جب ہوں تو وہ ہم سے خوش ہوں، راضی ہوں۔ جہاد کے واقعات، غزوات اور جنگوں کے واقعات پڑھیے۔ لوگوں نے خوشی خوشی جانیں دیں، بلکہ ایسا شوق تھا کہ ایک بچہ احد کی جنگ کے موقع پر آیا اس نے کہا: یارسول اللہ ﷺ مجھے بھی جہاد کرنے کی اجازت دیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ابھی تم چھوٹے ہو۔ اس نے کہا: نہیں چھوٹا نہیں میں لڑ سکتا ہوں۔ اس نے بڑی خوشامد کی کسی نے سفارش بھی کی تو آپؐ نے اجازت دے دی۔ دوسرے صاحبزادے آئے جو ذرا چھوٹے تھے کہنے لگے: آپؐ نے انہیں اجازت دی تھی، مجھے بھی اجازت دے دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا: تم ابھی بچے ہو۔ اس نے عرض کیا: آپؐ ہماری کشتی کرا کر دیکھ لیجئے۔ اگر میں اس کو پچھاڑ دوں تو مجھ کو اجازت دے دیجئے۔ یہ بچوں کا شوق تھا، کشتی ہوئی اس نے واقعی پچھاڑ دیا اور آپؐ نے اس کو بھی اجازت دے دی اور وہ شہید بھی ہوئے۔ ابوجہل کو دیکھ کر دونوں بھائیوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے کہا کہ ہمیں ابوجہل کو دکھائیے۔ ہم نے سنا ہے کہ اس نے رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے میں یہ شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں، ابوجہل کے پہچاننے پر دونوں لپک پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا۔

اس چھوٹے روزہ کا حکم اور اس کی پابندیاں سب کو معلوم ہیں۔ سب روزہ دار کھانے پینے سے اور ان تمام چیزوں سے بچتے ہیں جو ممنوع ہیں۔ لیکن اس بڑے روزہ کا خیال بہت کم لوگوں کو ہے حالانکہ یہ روزہ ہم لوگوں کو اس بڑے روزہ کے طفیل ہی ملا ہے۔ اس بڑے روزہ کی برکت سے ملا ہے، یوں سمجھئے کہ اس بڑے روزہ کے انعام میں ملا ہے، اور عید بھی اسی روزے کے طفیل میں ملی ہے۔ اگر اسلام نہ ہوتا تو نہ نماز ہوتی، نہ روزہ ہوتا اور دیکھ لیجئے جہاں اسلام نہیں، وہاں نہ نماز ہے نہ روزہ، نہ کلمہ ہے، نہ اللہ پر یقین ہے، نہ اس کے واحد ہونے کا یقین ہے، نہ حشر کا نہ روز قیامت، نہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا یہ سب دولت ایمان ہم کو اسلام کے طفیل ملی ہے۔ ہم گنا بھی نہیں سکتے کہ کیا کیا دولتیں ہم کو اسلام کے طفیل ملی ہیں۔ اسلام کے طفیل میں آدمیت ملی ہے، انسانیت ملی ہے، عزت ملی ہے، طاقت ملی ہے، روحانیت ملی ہے، اور مرنے کے بعد قیامت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت ملے گی، اس کا تو پوچھنا ہی کیا۔ "نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا" تو اس (طویل و مسلسل) روزے کا لوگوں کو کم خیال آتا ہے۔ اب ہم آپ کو بتاتے ہیں، معلوم نہیں پھر کبھی ہماری آپ کی ملاقات ہو یا نہ ہو اور

ہمیں کچھ کہنے سننے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ بڑے کام کی بات آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اس روزہ (رمضان کے روزہ یا نفلی) میں پانی پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، کھانا کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، یہ روزہ ٹوٹ جائے تو ساٹھ روزے رکھنے چاہئیں تب ان کی قضا ہوگی۔ لیکن وہ روزہ، اسلام کا روزہ ہے اس کا بہت کم لوگوں کو خیال ہے ہم بتاتے ہیں کہ اس میں کیا کیا چیزیں منع ہیں۔ اس میں کھانے پینے کی محدود چیزیں جو حرام ہیں منع ہیں۔ اس میں شرک منع ہے، سب سے بڑی چیز جو اللہ کو ناپسند ہے وہ یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء** قرآن مجید میں صاف آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا، باقی جس کو چاہے گا معاف فرمادے گا۔

شرک کیا ہے، آپ سن لیجئے۔ اس کو سب برا سمجھتے ہیں آپ بھی برا سمجھتے ہونگے۔ عقیدہ یہ ہے کہ کارخانہ عالم اللہ کا بنایا ہوا ہے اور وہی چلا رہا ہے **"الا لہ الخلق والامر"** اسی کا کام ہے پیدا کرنا، اسی کا کام ہے چلانا، اسی کو مانتے ہیں کہ خالق ارض وسموات اور کائنات چلانے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن بہت سے بھائی ایسے ہیں جن کے دل میں اور کبھی ان کے دماغ میں یہ بات پورے طور سے جذب نہیں ہوتی کہ کائنات کا چلانے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ایسا سمجھتے ہیں کہ کارخانہ عالم تو اللہ نے بنایا **"کن فیکون"** کہہ دیا بس بن گئی لیکن چلانے میں دوسری ہستیاں شریک ہیں، جیسے کوئی بادشاہ اپنی مرضی سے کوئی کام کسی کے سپرد کردے، کسی کے ذمہ کردے بھائی تم خیرات بانٹا کرو، تم دیکھو کھانے پینے کا خیال رکھنا، غلہ پہنچادو جس کی ضرورت ہو، کوئی بیمار ہو اس کو شفا دے دو، کسی کے اولاد نہیں ہے اس کو اولاد عطا کرو، کوئی کسی مصیبت میں گرفتار ہے اس کی خلاصی کردو، کس کا مقدمہ جتادو وغیرہ وغیرہ۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے مقبول بندوں کے ذمہ کچھ کارخانے کردیئے ہیں تو اس میں اللہ کی شان کے خلاف کوئی بات نہ ہوگی۔ ان کی قبولیت اور بزرگی کی وجہ سے اور اپنے ارادہ سے سپرد کیا ہے اور جب چاہے گا لے لے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرا ہی کام ہے پیدا کرنا، اور میرا ہی کام ہے چلانا اور حکم دینا **"الا لہ الخلق والامر"**۔

یہ دنیا تاج محل نہیں ہے کہ شاہجہان بنا کر چلے گئے اب اس کے بعد کوئی چاہے دیوار پر کچھ لکھ دے، دھبہ لگادے کوئی حصہ توڑ دے، وہ کچھ نہیں کرسکتے، ان کے بس میں کچھ نہیں، اور شاہجہان

کیا خواہ بڑے سے بڑا بادشاہ اور حکمراں ہو۔

لیکن وہ کارخانہ یعنی کارخانہ عالم پورے طور سے اسی کے قبضہ اور اختیار میں ہے۔ وہی خالق کائنات ہے، ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور وجود بخشنے والا ہے۔ اور وہی حکمران، سیاہ سفید کرنے والا، جلانے مارنے والا، روزی اور اولاد دینے والا ہے۔ **انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون** اولاد دینا، روزی دینا، قسمت اچھی بری کرنا، ہرانا جتانا، اور کسی کو عزت دینا کسی کی آئی ہوئی بلا کو ٹال دینا یہ سب اللہ کے قبضہ میں ہے اور ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا۔ اس دنیا کا ایک پتہ بھی اور ایک ذرہ بھی اس کے حکم کے بغیر ہل نہیں سکتا۔ پوری باگ ڈور عنان حکومت اور کنجی اس کے ہاتھ میں ہے۔

ایک بات تو یہ ہے کہ توحید کامل ہونی چاہیے۔ اولاد وہی دے سکتا ہے، روزی وہی دے سکتا ہے، عزت وہی دے سکتا ہے، جلانا مارنا اسی کا کام ہے، یہ نہ کسی ولی کے قبضہ میں ہے نہ کسی قطب کے قبضہ میں ہے، نہ کسی غوث کے قبضہ میں ہے نہ کسی ابدال کے قبضہ میں ہے۔ ایک بات یہاں سے لے کر جائیے۔ پہلے عقیدہ توحید کو جانچئے کہ آپ اللہ ہی کو مسبب الاسباب سمجھتے ہیں اور خالق و رازق سمجھتے ہیں۔

ایک بات تو یہ، اور اس کے بعد دوسری بات قیامت کا یقین و آخرت کا یقین ہے اور اس کے بعد حضور اقدس ﷺ کو آخری پیغمبر ماننا خاتم النبیین سید المرسلین شفیع المذنبین کا محبوب رب العالمین ماننا اور یہ ماننا کہ شریعت انہی کی چل رہی ہے اور قیامت تک چلے گی اور آخرت میں کام آئے گی۔ قیامت تک اور کسی کی شریعت نہیں چلے گی۔ اگر کوئی آپؐ کے بعد نئی شریعت لے کر آئے تو وہ کذاب اور دجال ہے، ملحد ہے دین کا باغی ہے، اور واجب القتل ہے۔ شریعت شریعت محمدیؐ ہے اور وہی قیامت تک چلے گی اور ہر جگہ چلے گی۔ اس پر جو چلے گا وہی فلاح یاب ہوگا اور سرخرو ہوگا۔

آپؐ حبیب خدا ہیں جو آپؐ سے محبت کرے خدا اس سے محبت کرتا ہے اور آپؐ نے فرمایا: **لا یومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین** ''تم میں سے کوئی مومن نہیں جب تک کہ میں اسے اپنے باپ سے بیٹے سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں''۔ یہ مرتبہ اور کسی بزرگ، ولی کیا چیز کسی نبی اور

رسول کو بھی نہیں ملا۔ یہ مرتبہ خدا نے آپ کے لئے رکھا تھا ایک تو یہ کہ آپ پر ایمان بھی ہو، عقیدہ بھی ہو، محبت بھی ہو، اور شفاعت کا شوق بھی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ میں شریعت پر چلنے کا اہتمام بھی ہو آپ پوچھیں آپ کے اندر جذبہ اور جستجو اس بات کی پیدا ہو کہ مسئلہ بتائیے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں میں یہ بات پورے طور پر نہیں ہے۔ شادی بیاہ کس طریقہ پر ہو، حضور ﷺ اور صحابہؓ کا کیا طریقہ کار تھا خوشی کا اظہار اور غم کا اظہار بھی شریعت وسنت کے مطابق ہونا چاہیے۔ ماتم کرنا، گانا بجانا، یہ تزک واحتشام، دھوم دھام اور شادیوں میں وہ سب کام کرنا، چاہے سود لے کر اور زمینیں بیچ کر، رشوت لے کر ہو بس جس سے نام ہو، ہماری حیثیت عرفی بلند ہو لوگوں میں اونچے سمجھے جائیں۔ اور یہ جہیز کا مطالبہ اور نہ دینے پر نازیبا سلوک کہ گردن شرم سے جھک جائے کیسی بری بات ہے۔ یہ سب شریعت کے خلاف ہے اور اللہ کو ناپسند ہے۔ ان سب باتوں میں ہم شریعت کے پابند ہیں صرف نماز وروزہ میں ہی پابند نہیں ہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں پابند ہیں۔ ہر چیز میں ہمارے لئے نمونہ اسوہ رسول ﷺ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی یحببکم الله** ''اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا''۔ (آل عمران۔۳۱)

تو ایک بات یہ ہے کہ شریعت اسلام پر عمل ہو اور شریعت کو آپ سمجھیں کہ وہ پوری زندگی میں نافذ ہے پوری زندگی پر اس کا سایہ ہے پوری زندگی اس کے ماتحت ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ بس نماز وروزہ شریعت کے مطابق ہوں، اس کے لئے مسئلہ پوچھیں اور نکاح وطلاق، تجارت اور کاروبار میں آزاد ہیں، لاٹری بھی چل رہی ہے، جوا بھی چل رہا ہے، ٹیلی ویژن بھی دن رات چل رہا ہے۔ (جو لہو الحدیث کی بہترین تشریح ہے) اسراف اور فضول خرچی بھی چل رہی ہے، نمود و نمائش بھی جاری ہے ہمسایہ قوم کی نقالی بھی چل رہی ہے۔

ایک بات تو یہ ہے کہ اس کے بعد روزہ میں جیسے غیبت منع ہے ایسے ہی اس روزہ میں بھی غیبت منع ہے۔ اسی طرح جھوٹ بولنا فحش بکنا، رشوت لینا اور رشوت دینا، سود خوری، اسراف اور فضول خرچی ممنوع ہے۔ تو آپ یہ سمجھ کر جائیں روزہ کے بعد ہم آزاد ہیں، ہرگز نہیں، ہم آزاد نہیں ہیں۔ وہ روزہ برابر چلتا رہے گا، وہ روزہ اب بھی ہے۔ بلکہ وہ اس روزہ پر بھی سایہ فگن ہے اور یہ روزہ کا جزو ہے جو آپ رکھ رہے ہیں۔ وہ روزہ چلتا رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ محض

اپنے فضل و کرم سے ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔ یہی سب سے بڑی چیز اور تمنا کرنے کی ہے، بلکہ جس کے لئے جان کی بازی بھی لگا دینا چاہیے۔ ہماری آزادی، غریبی، مفلسی، دوستی، دشمنی، کامیابی اور ناکامی یہ سب گزر جائے گی، بس خاتمہ ایمان پر فرمائے۔ اولیاء اللہ کو اس کی بڑی فکر تھی ان کے حالات پڑھیے، جن کا نام لینے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ ان کو یہ فکر ہوتی تھی، بلکہ دوسروں سے دعا کراتے تھے کہ خاتمہ بخیر ہو۔ سب کے دل کو یہ لگی ہوئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے خاتمہ بخیر فرمایا ان کا ذکر خیر باقی رکھا۔

رمضان ختم ہونے کے بعد آپ یہ نہ سمجھیں کہ چھٹی ہوگئی اب ہم آزاد ہیں جو چاہیں کریں۔ ہرگز ایسا نہیں، آپ آزاد بالکل نہیں ہیں۔ آپ کے گلے میں اسلام کا طوق پڑا ہوا ہے۔ آپ کی تختی، آپ کے شناختی کارڈ پر لکھا ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس روزہ کا حساب ہوگا اور اس روزہ کا بھی حساب و کتاب ہوگا۔ ہم نے آپ کے سامنے آیت پڑھی:

الیوم اکملت لکم دینکم واتمعت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ چاہے کوئی تبدیلی لانا چاہے، سلطنت کہے، بادشاہ کہے، کہ ایسا کرو اور ویسا کرو، بڑے سے بڑا مسلمان اور علم کا دعویٰ کرنے والا کہے، کچھ ہونے کو نہیں۔ جو چیز حرام ہے قیامت تک حرام رہے گی۔ دنیا میں کسی کو یہ اجازت نہیں اور نہ اس کی مجال ہے کہ اس میں ترمیم کرے۔ شریعت میں اب کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی۔ وہ چیزیں جو حرام ہیں حرام ہی رہیں گی۔

یہاں سے آپ ارادہ کر کے جایئے کہ اگر کسی کی جائداد آپ کے قبضہ میں ہے اور آپ کی نہیں ہے تو اس روزہ کا تقاضا ہے کہ آپ اس جائداد کو چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ اس پر بڑا خوش ہوگا، آپ اللہ کے خوف سے ایسا کریں اور کہیں کہ لو اپنی جائداد اپنا تر کہ یہ تمہیں مبارک ہو اب ہم نے توبہ کی ہے تم جھوٹ بولنا، جھوٹی گواہی دینا، دل آزاری کرنا، گالی بکنا، ناجائز، حرام ذرائع آمدنی، رشوت وغیرہ جن سے پیسے ملتے ہیں حرام ہی ہیں اور قیامت تک ناجائز ہی رہیں گی اسی طرح سود ہے کہ بعض لوگ اس دور پر فتن میں اس کے جواز کی شکلیں نکال رہے ہیں، کس قدر افسوس ناک بات ہے جس چیز کو شریعت و دین نے حرام قرار دے دیا، قیامت تک حرام ہی رہے گی۔

کوشش یہ کیجئے کہ آپ کا روزہ صحیح طریقہ پر اس کا افطار ہو، شاہ غلام علی صاحب مجددی دہلوی

نقشبندیہ مجددیہ سلسلہ کے کبار مشائخ میں تھے۔ نواب میر خاں نے جوان کے مرید تھے، ارادہ کیا جب انہوں نے سنا کہ حضرت کے یہاں پانسو پانسو آدمی رہتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں اور آپ ہی کو ان کی ضروریات پوری کرنا پڑتی ہیں۔ کوئی آمدنی نہیں، کوئی جائداد نہیں تو انہوں نے ایک بڑی رقم پیش کرنا چاہی اور کہا کہ حضرت اس کو قبول فرمالیں، فرمایا کہ فقیر نے روزہ رکھا تھا اور جب آفتاب ڈوبنے لگے تو کوئی روزہ نہیں توڑتا۔ اب میرا آفتاب عمر ڈوبنے کے قریب ہے۔ اب کوئی جتنا کہے کہ یہ چیزیں لے لو، یہ دوا کھالو، میں روزہ نہیں کھولوں گا کہ تمام دن روزہ رکھا اور اب جب افطار کا وقت قریب ہے تو توڑ دوں۔

ہر شخص کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اسلام کا روزہ ہے، ساری عمر کا روزہ ہے کبھی نہیں ٹوٹ سکتا جو چیزیں حرام ہیں، حرام ہیں، غلط ہیں، عقیدہ خالص ہونا چاہیے سمجھ لیجئے نہ کوئی قسمت بری بھلی بنا سکتا ہے نہ کوئی آئی ہوئی بلا کو ٹال سکتا ہے، نہ اولاد دے سکتا ہے نہ نوکری دلاسکتا ہے، کہ آپ کسی اور سے مانگیں، جو کچھ مانگنا ہو اسی سے مانگیں جو سمیع و مجیب ہے، وہ فرماتا ہے: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اپنے رسولؐ سے کہ بندہ تجھ سے میرے بارے میں پوچھے تو کہہ دیجئے کہ میں قریب ہوں۔ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ دعا کرے''۔

آپ یہاں سے بڑے روزے کا خیال لے کر جایئے خوش ہوئیے اللہ کا شکر ادا کیجئے، یہ روزہ تو ختم ہو رہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اور رمضان نصیب کرے۔ مگر زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، صحت کا اعتبار نہیں، ہاں وہ مسلسل وطویل روزہ رہے گا، وہ روزہ مبارک ہو، اس روزہ کا خیال رکھئے وہ روزہ نہ توڑیئے گا وہ روزہ اگر ٹوٹا تو سب کچھ ٹوٹ گیا سب کچھ بگڑ گیا۔

بس یہی دو روزے ہیں ایک روزہ ہے قریب المیعاد وہ ہے رمضان کا روزہ اور دن بھر کا روزہ ہے۔ ایک روزہ وہ ہے جو زندگی کے ساتھ رہے گا، اور مسلمان کے لئے جب سے وہ بالغ ہوا، اس دن تک جب تک سانس اور جان میں جان ہے اور وہ شخص جس نے اسلام قبول کیا اس کا بھی جب تک بدن میں اس کے جان اور روح ہے اس وقت تک باقی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو توفیق دے کہ ہم اس روزے کو برقرار رکھیں، اس روزے کی حفاظت کریں اور قدر کریں، اور اس روزے پر جئیں اور مریں۔

روزہ کی حقیقت کا بیان

امام ابو حامد الغزالیؒ

روزہ کے تین درجے ہیں۔ عوام، خواص اور اخص الخواص کا روزہ، عوام کا روزہ تو وہی ہے جس کا بیان ہو چکا یعنی کھانے پینے اور جماع سے بچنا اور یہ روزے کا ادنیٰ درجہ ہے۔ اخص الخواص کا روزہ درجہ کے اعتبار سے اعلیٰ ترین ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے دل کو ماسوائے اللہ کے خطرات سے بچائے۔ اور اپنے آپ کو بالکل اللہ کے سپرد کر دے اور جو چیز اللہ کے سوا ہے اس سے ظاہراً باطناً الگ ہو جائے، جب کلام الٰہی اور اس کے متعلقات کے سوا کسی اور چیز کا خیال کرے گا تو پھر روزہ نہیں رہے گا۔ دنیوی اغراض کا خیال آنا اگرچہ مباح ہے مگر اس روزہ کو باطل کر دیتا ہے۔ ہاں ایسے دنیوی امور جو دین کے باب میں مددگار ثابت ہوں، وہ کار دنیوی نہیں کہلاتے، حتیٰ کہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی دن میں افطاری کی تدبیر کرے تو یہ بھی کار گناہ ہے، اس واسطے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رزق کے معاملے میں جو اللہ نے وعدہ کیا ہوا ہے، اس شخص کو اس پر کامل یقین نہیں۔ یہ مرتبہ انبیاء اور صدیقین کا ہے۔ ہر شخص اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور خواص کا روزہ یہ ہے کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنے کے ساتھ آدمی اپنے تمام اعضاء و جوارح کو ناشائستہ حرکات سے بچائے۔ اور یہ روزہ چھ چیزوں سے مکمل ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آنکھ کو ایسی چیزوں سے بچائے جو دل کو اللہ کی طرف سے پھیرنے کا موجب ہوتی ہیں۔ بالخصوص ایسی چیزوں کو دیکھنے سے بچے جو شہوت کا باعث ہوں۔ اسی واسطے جناب حضور ﷺ نے فرمایا کہ نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک ایسا تیر ہے جو زہر میں بجھا ہوا ہوتا ہے۔ جو اللہ کے خوف کی وجہ سے اس سے بچے گا اس کو ایمان کا ایسا خلعت نصیب ہوگا جس کی حلاوت انسان اپنے دل میں محسوس کرے گا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جناب سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ پانچ چیزیں روزہ کو توڑتی ہیں، جھوٹ، غیبت، چغل خوری، جھوٹی قسم کھانا اور شہوت کے ساتھ کسی کی طرف دیکھنا۔

دوسری چیز یہ کہ بیہودہ گوئی اور بے مقصد باتوں سے زبان کو بچائے۔ ذکر الٰہی اور تلاوت

قرآن مجید میں اپنے آپ کو مشغول رکھے اور یا پھر خاموش رہے، بحث اور جھگڑا بیہودہ گوئی میں داخل ہے لیکن غیبت اور جھوٹ تو بعض علما کے نزدیک روزہ کو باطل کر دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں دو عورتوں نے روزہ رکھا تو پیاس کی وجہ سے ہلاکت کے قریب ہوگئیں۔ جب آپ سے روزہ کھولنے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے ایک برتن بھیجا کہ اس میں قے کریں چنانچہ ہر ایک کے حلق میں سے خون کے ٹکڑے نکلے، لوگوں کو اس سے تعجب ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ان دونوں عورتوں نے اللہ کی حلال چیزوں سے روزہ رکھا لیکن اس کی حرام کردہ چیزوں سے توڑ دیا، یعنی انہوں نے کسی کی غیبت کی اور یہ خون انہی آدمیوں کا گوشت ہے جو انہوں نے کھایا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ کان کو بری بات سننے سے بچائے، اس لئے کہ جو بات کہنی مناسب نہیں وہ سننی بھی مناسب نہیں۔ غیبت اور جھوٹ سننے والا کہنے والے کے گناہ میں شریک ہوتا ہے، چوتھی یہ کہ ہاتھ پاؤں وغیرہ کو ناشائستہ حرکات سے بچائے۔ جو روزہ دار ایسے برے کام کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بیمار میوے سے تو پرہیز کرے مگر زہر استعمال کرے، اس واسطے کہ طعام تو غذاء ہے۔ جس کا حد سے زیادہ کھانا نقصان دہ ہے لیکن اصل غذا مضر نہیں۔ اور گناہ زہر ہے۔ اسی واسطے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں بھوک اور پیاس کے سوا روزہ سے کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ پانچویں کہ افطار کے وقت حرام اور مشتبہ چیزیں نہ کھائے۔ اور حلال مال بھی بہت زیادہ مقدار میں نہ کھائے۔ اس لئے جب رات کو دن کا حصہ بھی کھالے گا تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ روزہ کا اصل مقصد تو خواہشات کا قطع کرنا ہے۔ اور ایک وقت ناغہ کر کے دوسرے وقت زیادہ کھانے سے خواہشات زیادہ بڑھتی ہیں خصوصاً جب انواع واقسام کے کھانے ہوں گے تو ان میں مزید اضافہ ہوگا۔ دل تو اس وقت صاف ہوگا جب معدہ خالی ہوگا بلکہ سنت یہ ہے کہ دن کو زیادہ سوئے بھی نہیں تاکہ بھوک پیاس اور ضعف اثر محسوس ہو اگر رات کو تھوڑا کھانا کھا کر جلدی نہیں سوئے گا تو تہجد کی نماز سے محروم رہے گا۔ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالے کے نزدیک بھرے ہوئے معدہ سے کوئی ظرف زیادہ برا نہیں۔

چھٹے یہ کہ افطار کے بعد اس امید میں مبتلا رہنا چاہیے کہ روزہ قبول ہوا یا نہیں۔ حضرت حسن بصریؒ عید کے دن ایک قوم کے پاس سے گزرے جو کھیل کود میں مصروف تھی تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالے نے رمضان کو ایک میدان بنایا ہے تا کہ اس کے بندے طاعت و بندگی میں پیش قدمی کریں ایک گروہ تو بازی لے گیا مگر ایک پیچھے رہ گیا۔ تعجب ہے ان لوگوں پر جو کھیل کود میں مشغول ہیں اور اپنی حقیقت کو بھول چکے ہیں قسم ہے پروردگار عالم کی اگر پردہ اٹھ جائے اور حقیقت حال واضع ہو جائے تو جن کی عبادت قبول ہے وہ خوشی میں اور جن کی مردود ہے وہ غمی میں مشغول ہو جائیں اور ہنسی کھیل کو سب بھول جائیں۔

ان تمام باتوں سے یہ بات سمجھنی آسان ہے کہ جو شخص محض کھانا پینا ترک کرنے پر اکتفاء کرے اس کا روزہ ایسے ہے جیسے بے روح صورت! اور روزہ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو فرشتوں کی مانند بنائے۔ کہ فرشتے خواہشات سے بالکل مبرا ہیں اور چوپائے خواہشات میں غرق ہیں اسی لئے وہ ملائکہ سے دور ہیں۔ اور جس آدمی پر خواہشات کا غلبہ ہو جائے وہ چار پایوں جیسا ہو جاتا ہے۔ اور جب اس کی خواہشات مغلوب ہو گئیں تو گویا اس نے فرشتوں سے مشابہت پیدا کر لی اور اس وجہ سے انسان صفات کے اعتبار سے فرشتوں کے قریب ہے مکانیت کے اعتبار سے نہیں۔ اور فرشتے اللہ تعالے کے مقرب ہیں تو وہ آدمی بھی اللہ کا مقرب ہو جائے گا۔ جب مغرب کی نماز کے بعد اہتمام کرے گا اور اپنی خواہش کے مطابق پیٹ بھر کر کھائے گا تو اس کی خواہشات کمزور ہونے کے بجائے قوی ہوں گی اور روزہ کی روح فوت ہو جائے گی۔

روزہ صوفیاء کی نظر میں

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

ارباب تحقیق اور اصحاب تصدیق کا ارشاد ہے کہ جس طرح جسمانی قوت کا انحصار کھانے پینے پر ہے اسی طرح روحانی قوت بھوک پیاس سے منسلک ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "بھوک اللہ کی خوراک ہے اس کی زمین میں"۔ حضرت حق جل ذکرہ کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ خود نہیں کھاتا اور سب کو کھلاتا ہے۔ اہل عقل کا اتفاق ہے کہ جب بندہ اس صفت سے موصوف ہو جائے تو اسے قرب خداوندی کا خاص مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اور وہ انسانیت کے منازل و مراحل سے ترقی کر جاتا ہے۔ حدیث نبوی "اور اپنے اندر اخلاق پیدا کرو" کے مطابق چونکہ روزہ دار خود نہ کھانے اور دوسروں کو کھلانے کے ذریعہ صفات محبوب میں قدم رکھتا ہے اور صفات بشریت سے اظہار برات کرتا ہے۔ بنابریں اسے دو عزتوں سے مشرف اور دو دولتوں سے نوازا جاتا ہے۔ چنانچہ سید الکونین ﷺ کا فتویٰ ہے: "روزہ دار کو دو فرحتیں نصیب ہوتی ہیں ایک فرحت افطار کے وقت اور دوسری فرحت حق تعالیٰ کے جمال باکمال کے دیدار کے وقت"

روزہ کھولنے کے وقت کی فرحت کو جانتے ہو کیا ہے؟ یہ جسم جس ترکیب مختلف عناصر سے ہوئی ہے۔ راہ دوست میں طالب کی سواری ہے، فرمان نبوی: "چاند دیکھ کر روزہ رکھو" کے مطابق کھانے پینے سے باز رکھا۔ اور پروردگار عالم تک پہنچنے کے راستے (**والی ربك المنتھی**) کی مسافت طے کرنے کے لئے اسے سرپٹ دوڑایا جب ایک منزل پوری ہوئی۔ نماز مغرب کا وقت آن پہنچا تو یہ سواری تھک کر آگے چلنے سے عاجز ہوگئی۔ اور جب افطاری کے ذریعے اسے دانہ پانی میسر آیا تو سوار کو اس کے تازہ دم ہو جانے پر ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ اس کے مقابلے میں تمام مسرتیں غم واندوہ نظر آئیں گی۔

اور دوسری خوشی کسی کے بیان میں نہیں آسکتی کیونکہ وہ ذوق اور تجربہ پر موقوف ہے اور چکھے بغیر اس کی لذت معلوم نہیں ہو سکتی۔ اہل عقل کو یہ (ارشاد نبوی) معلوم ہے "اللہ تعالے کے لئے نور کے ستر ہزار پردے ہیں، اگر ان میں ایک بھی پردہ اٹھادے تو اس کے جمال کی شعاعیں ان تمام چیزوں کو جن تک اس کی نظر جائے جلا کر خاکستر کر دیں"۔ جب پردہ نور کے مقام میں سب کچھ خاکستر ہو کر رہ جاتا ہے تو اس ملاقات کی کیفیت و مسرت کون بیان کر سکتا ہے۔ یہی

مطلب ہے بزرگوں کے اس ارشاد کا کہ "مشاہدہ کی حالت میں بیان کی طاقت ساقط ہو جاتی ہے"۔ کسی شیخ طریقت نے کشف میں خواجہ معروف کرخی کو دیکھا کہ نشہ محنت کی مستی میں عرش کے نیچے نعرے لگاتے ہیں۔ حق تعالی نے فرشتوں سے فرمایا (حالانکہ وہ خود جانتا ہے) کہ یہ کون ہے؟ اور اس کی آہ و فریاد کیسی ہے؟ فرشتوں نے عرض کیا،،،،،،،،،،، آپ کا بندہ معروف کرخی ہے، ارشاد ہوا ہاں،، یہ میرا بندہ معروف ہے۔ میری شراب محبت سے مست ہے۔ اور میرے دیدار ہی سے اسے افاقہ ہو سکتا ہے۔ اسی معنی کی طرف صاحب شریعت ﷺ نے اپنے ارشاد میں اشارہ فرمایا: اپنے پیٹ کو بھوکا، جگر کو پیاسا اور جسم کو (بے ضرورت زینت سے) برہنہ رکھو تا کہ تم اپنے پروردگار کے دیدار کا مشاہدہ کر سکو۔ بزرگوں کا ارشاد ہے: جس کو دیدار ہوا وہ پہنچ گیا، اور جس کو وہاں تک رسائی ہوئی وہ فناء سے گزر کر مقام بقاء تک پہنچ گیا۔ اور محبوب کے چہرے کی شعاعوں سے جل گیا،،۔ حق تعالے کا ارشاد ہے "اور کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا"۔

جو شخص اس مقام پر فائز ہونے کے بعد اسے زبان سے بیان کرے وہ گمراہوں میں سے ایک گمراہ ہے۔ اور جو اس حالت میں اس کی طرف اشارہ کرے وہ اندھوں میں سے ایک اندھا ہے۔ کشف المحجوب میں ہے کہ روزہ بدن کے لئے بلا، دل کے لئے صفاء، جان کی ولا (دوستی)، اور سر کی بقاء (پاکیزگی) ہے۔ جب روزہ کی برکت سے دل کی صفائی، جان کو ولائیت اور لطیفہ سر کو طہارت کی دولت میسر آئی تو کیا حرج ہے۔ اگر بدن کو تھوڑی سی تکلیف (بلا) پہنچے۔ اسی معنی میں ہے آنحضرت ﷺ کا ارشاد جو آپ ﷺ نے اللہ تعالے سے نقل کیا ہے۔ ترجمہ ابن آدم کا ہر عمل ستر گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ سوائے روزہ کے، کیونکہ وہ میرے لئے ہے۔ اور میں خود ہی اس کی جزا دوں گا۔

یہ جو فرمایا کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کا بدلہ دوں گا۔ کہا گیا ہے کہ مراد اس سے روزہ دار ہے، اہل عرب کی یہ عادت ہے کہ وہ صفت کو ذکر کرتے ہیں اور مراد اس سے موصوف لیتے ہیں۔ اگر اسے صرف اتنا کہہ دیا جاتا کہ تو اس دروازے کا کتا ہے، تب بھی اس کی عزت اور دولت کے لئے کیا کم ہوتا اب جبکہ شہنشاہ عالم جل ذکرہ اس سے فرماتے ہیں کہ،، تو میرا ہے،، تو اس کی رفعت و سربلندی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

قرآن اور عقل

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری

دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس نے عقل سے کام لینے پر اتنا زور دیا ہے جتنا زور قرآن نے دیا ہے۔ اس نے کئی پہلو اور کئی لفظوں سے عقل کو کام میں لیتے رہنے کی ترغیب دی ہے۔ مثلاً لفظ **حکمة** سے-----**ویعلم اکتب والحکمة** یہ رسول تمہیں کتاب اور دانائی (حکمت) کی تعلیم دیتا ہے۔ **ومن یوتی الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا** جسے حکمت اور دانائی عطا ہوئی اسے بیشمار بھلایاں مل گئیں۔

لفظ لب سے---**وما یذکر الا اولی الالباب** اہل عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں

لفظ بصیرت سے **فاعتبروا یا اولی الابصار** عقل والو عبرت حاصل کرو افلا **تبصرون** تم بصیرت سے کام نہیں لیتے؟

لفظ فقہ سے---- **لو کانوا یفقھون** کاش یہ سمجھ سے کام لیتے

لفظ شعور سے **وما یشعرون** یہ شعور سے کام نہیں لیتے

لفظ عقل سے **افلا تعقلون** تم عقل سے کام نہیں لیتے

لفظ تدبر اور تفکر سے **افلا یتدون القرآن** قران پر غور نہیں کرتے **لقوم یتفکرون** یہ قرآن غور و فکر والوں کے لئے ہے۔

اس کے علاوہ لفظ قلب سے مراد بھی ایسی قوت ہے جو عقل سے کام لے **لھم قلوب لا یفقھون بھا** ان کے دل ایسے ہیں جن سے وہ عقل کا کام نہیں لیتے

ان مثالوں سے ہر ایک کے تیور بتا رہے ہیں کہ قرآن عقل پیدا کرنے پر پورا پورا زور دے رہا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ زوردار اور صاف الفاظ میں سننا چاہتے ہوں تو ان آیات پر غور کریں۔ **صم بکم عمی فھم لا یعقنون** بہرے گونگے اندھے ہیں اس لئے یہ عقل سے کام نہیں لیتے۔

ان شد الدواب عند الله الصم البکم الذین لایعقلون خدا کے

نزدیک بدترین مخلوق وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون اور ان لوگوں پر پلیدی ڈالتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

وقالو الوکنا نسمع او نعقل ماکنا فی اصحب السعیر (کفار کہیں گے کہ) کاش ہم نے سنا اور عقل سے کام لیا ہوتا تو ہم جہنمی نہ بنتے۔

اللہ اکبر! کیا عقل کی تائید اور بے عقل کی برائی میں اس سے زیادہ بھی کچھ کہا جا سکتا ہے؟ لیکن سوچئے کہ آخر دین سے عقل کو یا عقل سے دین کو جدا کیوں کر دیا گیا ہے۔ دراں حالے کہ دین ہی سب سے زیادہ عقل پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان واضح آیات کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ لیکن ایک نہایت اونچی بات تو آنحضرتؐ نے فرمائی ہے۔ امام ابن جوزی نے اپنی کتاب الاذکیا مطبوعہ مصرہ ۴ میں ایک عجیب حدیث نقل کرتے ہیں۔ جس پر غور کرنے کے بعد بے عقلی کا آخری تسمہ بھی کٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ اسے غور سے پڑھیں۔

عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ وہ عائشہؓ کے پاس گئے اور پوچھا کہ اے ام المومنین زرا بتائیے تو سہی کہ ایک آدمی ہے جو شب بیداری کم اور آرام زیادہ کرتا ہے، اور دوسرا شب زندہ داری زیادہ اور آرام کم کرتا ہے تو آپ کو ان دونوں میں کون سا زیادہ پیارا ہے؟ عائشہؓ نے فرمایا! جو تم نے مجھ سے سوال کیا ہے بالکل وہی سوال میں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا، حضورؐ نے جواب دیا کہ ان دونوں میں جس کی عقل زیادہ اچھی ہو۔ میں (عائشہ) نے عرض کیا یا حضور میں تو ان دونوں کی عبادت کے بارے میں سوال کر رہی ہوں۔ اور حضورؐ نے جواب دیا ہے عقل کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا اے عائشہ ان دونوں سے باز پرس تو ان کی عقلوں ہی کے بارے میں ہوگی۔ پس جو عاقل ہوگا وہی افضل ہوگا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس فرمان نبویؐ سے واضح ہوتا ہے کہ شب بیداری اور عبادت و ریاضت کا مقصد محض چند کلمات و حرکات یا چند مراسم کا ادا کرنا نہیں بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد عقل و شعور اور تفقہ و بصیرت پیدا کرنا ہے۔ ,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,(باز پرس عقل کے بارے میں ہوگی) کا جملہ ہی بڑا معنی خیز ہے۔ یعنی یہ باز پرس نہ ہوگی کہ تم نے تہجد پڑھی ہے یا نہیں؟ مگر یہ باز پرس ضرور ہوگی کہ تم

نے اس تہجد سے اپنے اندر قوت فکر یہ وعقلیہ کتنی پیدا کی اور اس سے تمہاری سمجھ بوجھ میں کتنا اضافہ ہوا؟ ظاہر ہے اسلام اپنی عبادات کے ذریعے انسان کو بے عقل نہیں بنانا چاہتا۔ بلکہ ان میں لا انتہا ارتقاپزیر عقل ودانائی پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اسی جگہ ابن جوزی نے ایک اور قابل غور حدیث بھی یوں نقل کی ہے

(عبداللہ بن عمرؓ آنحضور کا یہ بیان نقل کرتے ہیں ،،،،،،،،،،،،،، کہ: کسی کے اسلام سے اس وقت تک خوش نہ ہو جب تک اس کی محکوم عقل نہ جان لو)

گویا محض عبادت کا معاملہ ہی نہیں بلکہ پورے اسلام کا مقصد بھی پائیدار عقل ودانش پیدا کرنا ہے، یعنی اسلام سراپا عقل وحکمت ہے جو اپنے پیروں کو بہرا، گونگا، اندھا اور بے عقل نہیں بنانا چاہتا بلکہ عاقل وفرزانہ بنانا چاہتا ہے۔ کہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے اور ہر بات پورے شعور سے کہی جائے۔ گویا اندھی تقلید نہیں چاہتا۔ کورانا اور غیر شعوری تقلید تو ایک ایسی لغویت ہے جس کے بارے میں مولانا رومی کو بھی "چندصد لعنت بریں تقلید باد" کہنا پڑا۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت بہت غور طلب ہے۔ قرآن میں جہاں **عباد الرحمن** کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہاں ایک صفت یوں بیان ہوئی ہے۔ ،،،،،،،،،،،،،،،،،، انہیں جب آیات ربانی کی یاد دلائی جاتی ہے تو ان پر بہرے اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔

یعنی آیات ربانی کو بھی بے سمجھے محض، خوش اعتقادی، سے نہیں مان لیتے بلکہ شعوری وعقلی طور پر سمجھ بوجھ کر اس پر ایمان لاتے ہیں۔ مطلب یہ وہ یونہی اندھے ہو کر حکم الہی پر نہیں گر پڑتے بلکہ اس کی حکمت اور فلسفے کو بھی سمجھتے ہیں۔ تمام پہلوؤں اور مصالح کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ انطباق کے مواقع کو بھی پہچانتے ہیں۔ اور سیاق وسباق کی بھی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ دوسرے احکام سے اس کے ربط کا فہم رکھتے ہیں۔ اور نیز اس کے اندر سے نئے نئے حقائق کے موتی نکالنے کی فکر میں بھی لگے رہتے ہیں۔ یہ ہیں معنی اندھے ہو کر نہ گرنے کے۔ یہ ساری باتیں اس لئے ہیں کہ قرآن نہ پڑھنے والوں میں عقل وشعور، حکمت ودانائی زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائے۔

اگر قرآن پر بے سمجھے بوجھے بہرے، اندھے بن کر گر پڑنے کی اجازت دی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا کے کلام کے بعد انسانی کلام کی بے سمجھے اندھی تقلید کی عادت پڑ جائے گی

پیا کہ آخر پڑ ہی گئی اور تقلید جامد جزو ایمان بن کر رہ گئی۔ حالانکہ دونوں میں فرق اور عمیق فرق ئم رہنا چاہئے تھا۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ کسی حکم الٰہی کی حکمت سمجھ نہ آئے تو اسے اپنے فہم و عقل کا قصور قرار دیا جائے گا مگر اس کے پر حکمت ہونے پر ایمان لازمی رکھنا ہوگا۔ لیکن انسانی نیر و تفسیر پر ایمان لانا اور بے سمجھے مان لینا ضروری نہیں۔ اگر وہ کتاب وحکمت کے مطابق نظر ئے گی تو مان لی جائے گی ورنہ اسے مفسر کی نیک نیتی کو مانتے ہوئے بھی رد کیا جا سکتا ہے۔

مگر ہوا یہ کہ غور و فکر کا تمام حق سلب کر لیا گیا، عقل وشعور اور تدبر اور تفکر پر قفل ڈال دیئے گئے۔ اور اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ہوا۔ خدا کی بخشی ہوئی سب سے بڑی نعمت عقل تھی، اس سے کام نہ لیا گیا تو عقل بھی زنگ آلود ہو کر رہ گئی۔ جس نعمت سے کام نہ لیا جائے گا اس کا یہی حشر ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے اسلاف کے متعلق قریباً وہی پوزیشن اختیار کر لی جو اہل کتاب ومشرکین نے اختیار کر لی تھی۔ ان سے جب کسی غلطی کو ترک کر کے راہ راست پر آنے کی فرمائش کی جاتی تو ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,, "ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی روش پر پایا ہے"۔ یہ سب کچھ نتیجہ اس بات کا تھا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہمارے اندر انتہائی عقل و دانائی پیدا کرنا چاہتا تھا اور ہم نے اسے تقلید و جامد سے بدل کر عقل وفہم کو بالائے طاق رکھ دیا۔

اس موقعے پر ایک نقطہ ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسلام نے ہمیں جہاں بے شمار نئی قدریں دی ہیں وہاں ایک قدر یہ بھی عطا کی ہے کہ عقل وہی عقل ہے جو سلیم ہو۔ عقل سلیم وہ عقل ہے جس کا مصرف صحیح اور حق ہو۔ عقل کا غلط مصرف لیا جائے تو وہ عقل سلیم نہیں بلکہ عقل سقیم ہے۔ قرآن چلتے پھرتے انسانوں کو موتےٰ (مردے) کہتا ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا وہ صحیح مصرف نہیں لیتے۔ وہ کان والوں زبان والوں اور آنکھ والوں کو بہرے، گونگے، اندھے کہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ عقل سلیم سے کام نہیں لیتے یعنی اپنی عقلوں کا مصرف غلط لیتے ہیں، عقل تو سارے منکرین و کفار بھی رکھتے تھے لیکن وہ مصرف غلط ہونے کی وجہ سے عقل سقیم تھی۔ (یہی ہیں دراصل بیوقوف) مولانا رومی کی اصطلاح میں ایسی عقل سقیم کو زیر کی کہتے ہیں۔

زیر کی ز ابلیس و عشق از آدم ست!

فلاح و سعادت دارین

صدرالدین

حضور نبی کریم ﷺ ساری انسانیت کی رہنمائی کے لیے آئے تھے اس لئے حضور نے جو طریق فلاح وسعادت تلقین فرمایا ہے وہ سب کے لیے یکساں ہے اور وہ اس قدر واضع ہے کہ چھوٹا و بڑا عالم و جاہل، مرد وعورت سفید رنگ اور کالے رنگ کا انسان، مغرب و مشرق کا باشندہ سب اسے نہایت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ فلاح وسعادت دارین کا انحصار اچھے اعمال پر ہے۔ اور اچھے اعمال کے بغیر اس کا حصول ناممکن ہے اور یہ اعتقاد کہ ہم حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں یا حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے ہیں یا محمد رسول اللہ صلعم کے خاندان سے ہیں اس وجہ سے ہم لازمی طور پر جنت کے وارث ٹھہرائے جائیں گے صحیح نہیں ہے حضور اکرم نے واضع الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ سعادت آخروی کا انحصار حسب نسب پر نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی پھوپھی صفیہ کو اور اپنی پیاری بیٹی فاطمۃ الزہراء کو یوں مخاطب فرمایا **ائتونی یوم القیامته بااعمالکم ولا بانسا بیکم** ۔ یعنی قیامت کے دن میرے پاس اپنے اعمال لے کر آنا اور یہ نہ کہنا کہ ہم محمد کے قریبی رشتے دار ہیں۔

مجھے جناب الٰہی کی جانب سے قطعا کوئی اختیار نہیں کہ تمہارے کام آ سکوں۔ ترجمہ "تمہارے زرہ بھر کام نہیں آسکتا"۔

اور فرمایا "خود میں بھی اس ہولناک دن کے عذاب سے خائف ہوں۔ جس سے میں بچ نہیں سکتا اگر خدا کے احکام کی نافرمانی کر بیٹھوں"۔ اس اہم ترین مسئلہ پر ان لوگوں کے لئے بھی روشنی ڈالی گئی جن کو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونے پر فخر ہے، حضرت ابراہیم نے اللہ تعالی کے حضور اپنی اولاد کی فلاح دارین کی التجا کی تو اللہ تعالی نے اس پر فرمایا کہ صرف تیری اولاد میں شمار ہونا فلاح دارین کا موجب نہیں ہوسکتا۔ تیری اولاد کے وہ افراد جو بداعمالی کے باعث اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہوں گے وہ فلاح پانے کی بجائے سزا پانے کے مستحق ہوں گے۔ حضرت ابراہیم کے مقالمہ کے الفاظ یہ ہیں، خدا نے فرمایا

یعنی آپ کو لوگوں کا امام مقرر کرتا ہوں اس پر حضرت ابراہیم نے یوں التماس کی۔ حضور میری اولاد بھی آپ کے انعامات کی مستحق ہوگی، فرمایا

میرے عہد کا فیض تیری اولاد کے ظالم یعنی بد اعمال لوگوں تک نہیں پہنچتا۔
اسی طرح کا معاملہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہے، انہوں نے باری تعالیٰ کی جناب میں دعا کی تھی کہ قوم کی نافرمانیوں اور بد کرداریوں کے باعث جو طوفان برپا ہوا ہے، میرا بیٹا جو میرے جگر کا ٹکڑا ہے اس میں غرق نہ کیا جائے بلکہ اس کو بچایا جائے، فرمایا وہ تو تمہارا بیٹا نہیں ہے اس لئے کہ اس کے اعمال اچھے نہیں ہیں، اس مقالے کے الفاظ یہ ہیں۔
یعنی "نوح نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا اے میرے مولا میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے اس کو بچالے تیرا وعدہ تو سچ نکلنا چاہیئے تو تو سب منصفوں سے بڑھ کر انصاف کرنے والا ہے۔ تیرا بیٹا تیرے اہل میں سے نہیں اس لئے کہ وہ مجسم بد اعمالی ہے پس جس بات کا تجھ کو علم نہیں اس بات کا مجھ سے سوال مت کر میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں کا طریق مت اختیار کر۔
مذکورہ بالا سطور سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی نسل سے ہونا یا حضرت نوح کی اولاد ہونا یا حضرت محمد ﷺ کا قریبی ہونا موجب فلاح نہیں ہوسکتا جب تک بزرگوں کی اولاد خود نیکوں کاروں کی زندگی بسر کرنے والے نہ ہوں جو ان بزرگ ہستیوں کی نسل میں سے جو لوگ بدکردار ہو جاتے ہیں وہ ضرور ذلیل ہو جاتے ہیں وہ فلاح نہیں پا سکتے عالی نسب ہونے سے ان کو راحت کی زندگی نصیب نہیں ہو سکتی نہ اس دنیا میں نہ دوسری دنیا میں۔ رسول کریم ﷺ نے کشف میں دیکھا کہ کچھ لوگوں کو دوزخ کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ حضور نے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں جواب ملا کہ، یہ آپ کی اُمت کے لوگ ہیں اس طرح حضور نے ایک مسلمان عورت کو دوزخ میں سزا پاتے دیکھ کر استفسار کیا کہ اس عورت کا کیا قصور ہے، جواب ملا، یہ عورت ایک بلی پر ظلم کرتی تھی اس بدسلوکی کی وجہ سے جو اس نے خدا کی مخلوق سے کی یہ سزا دی جا رہی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم کی تعلیمات پر جو مسلمان عمل نہیں کرتا ہو جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا مقصد ان کی تعلیمات پر کاربند ہونا ہے اور اپنے تئیں خدا کی مخلوق کے لئے مفید اور بابرکت ثابت کرنا ہے۔ جو شخص اس مقصد کو پورا نہیں کرتا اس پر خدا کس طرح راضی ہو اور کس طرح اس کو جنتی زندگی نصیب ہو، حضرت عمر فاروق ؓ نے اس اہم امر کے متعلق فرمایا، اگر عجمی قیامت کے دن اچھے اعمال لے کر میدان حشر میں آئے اور ہم بغیر اعمال کے وہاں پہنچے تو عجمیوں کو حضور کا قرب ہوگا نا کہ ہم کو۔

اقبالؒ کا تصور خودی

مرسلہ سید رحمت اللہ شاہ

اس بیان میں کہ خودی کی تبیت تین مراحل میں ہے، مرحلہ اول اطاعت

مفہوم: اونٹ کا کام خدمت اور محنت ہے، صبر اور مستقل مزاجی اس کی خوبیاں ہیں۔ سفر کے دوران اس کے پاؤں آواز پیدا نہیں کرتے یوں وہ قافلوں کے لئے ریگستان کی کشتی ہے۔ اس کے پاؤں کے نقوش ہر صحرا میں ملتے ہیں۔ تھوڑا کھانا، تھوڑا سونا اور محنت کرنا اس کا وطیرہ ہے۔ وہ کجاوہ کے بوجھ تلے مستانہ وار رقص کرتے ہوئے منزل کی جانب رواں رہتا ہے۔ وہ اپنی رفتار کے کیف ہی میں مست رہتا ہے اور سفر میں اپنے سوار سے زیادہ صابر ہوتا ہے۔ تو بھی اپنے فرائض سے سرتابی نہ کر، تاکہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھے مقام سے بہرہ ور ہو۔ اے غفلت شعار تو بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کوشاں ہو، کیونکہ جبر (ضبط) ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے۔ بے مایہ شخص بھی اطاعت (الٰہی) سے گراں قدر بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس آگ بھی سرکشی سے راکھ بن جاتی ہے۔ جس کسی نے چاند ستاروں کو مسخر کیا، اس نے پہلے اپنے آپ کو کسی آئین کا پابند بنایا۔ ہوا پھول کے قید خانہ میں رہ کر خوشبو بن جاتی ہے اور خوشبو قید ہو کر ہرن کا نافہ بن جاتی ہے۔ ستارہ قانون کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ سبزہ اگنے کے قانون کی پابندی کرتے ہوئے اگتا ہے اور جب اس قانون کو چھوڑ دیتا ہے تو پامال ہو جاتا ہے۔ گل لالہ کا قانون یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جلتا رہتا ہے، اس کی رگوں کے اندر اس کا خون بھڑکتا ہے۔ وصل کے قانون کی پابندی کرتے ہوئے قطرے دریا اور ذرے صحرا بن جاتے ہیں۔ ہر شے کی حقیقی پختگی آئین سے ہے تو کیوں اس سامان سے بے خبر جا رہا ہے۔ اے پرانے آئین (شریعت) سے آزاد شخص، اپنے آپ کو اسی نقرئی زنجیر کا پابند بنا۔ قانون کی سختی کا شکوہ مت کر (اور) نبی کریم ﷺ کی (بتائی ہوئی) حدود سے باہر نہ جا!

مفہوم: تیرا نفس اونٹ کی طرح اپنی پرورش میں لگا رہتا ہے، ساتھ ہی وہ خود پرست خود سوار اور سرکش بھی ہے۔ تو مرد بن اور اس کی باگ سنبھال تاکہ اگر تو کنکر بھی ہے تو گوہر بن جائے۔ جو اپنے اوپر حکم نہیں چلاتا، اسے دوسروں کی حکم برداری کرنا پڑتی ہے۔ تیری تعمیر مٹی سے کی گئی ہے اور تیرے اندر محبت اور خوف کی آمیزش رکھی گئی ہے۔ دنیا کا خوف، آخرت کا خوف، جان کا خوف، زمین و آسمان کے مصائب کا خوف، (جبکہ دوسری طرف) مال و دولت کی محبت، وطن کی محبت، عزیز و اقارب کی محبت، عورت کی محبت، پانی اور مٹی کے امتزاج سے بدن کی پرورش ہے اور پھر یہ بدن بے حیائی اور ممنوعہ کاموں کا ارتکاب کرتا ہے۔ جب تک اپنے ہاتھ میں لا الہ کا عصا رکھے گا، تو ہر قسم کے خوف کے طلسم کو توڑ دے گا جس کے اندر حق تعالیٰ جان کی طرح بسا ہو

اس کی گردن باطل کے آگے نہیں جھکتی۔ ایسے شخص کے سینہ میں خوف کی کوئی گنجائش نہیں، اس کا دل کبھی بھی غیر اللہ سے مرعوب نہیں ہوتا۔ جو کوئی توحید کی سلطنت میں آباد ہوتا ہے وہ زن و اولاد کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص غیر اللہ سے لاتعلق ہو جاتا ہے، پھر وہ بیٹے کی گردن پر بھی چھری رکھ دیتا ہے۔ ایک اللہ کے ساتھ ہونا یوں ہے جیسے کثیر تعداد لشکر کے ساتھ ہونا، اس کی نظر میں جان ہوا سے بھی ارزاں ہوتی ہے۔ کلمہ طیبہ صدف ہے اور نماز اس کا گوہر مومن کے قلب کے لئے نماز حج اصغر کی مانند ہے۔ نماز مسلمان کے ہاتھ میں خنجر کی مانند ہے، یہ بے حیائی سرکشی اور برے کاموں کو ختم کر دیتی ہے۔ روزہ، بھوک پیاس پر شب خون مارتا ہے اور تن پروری کے قلعہ کو توڑ دیتا ہے۔ حج اہل ایمان کے قلوب کو (تجلیات ذات سے) منور کر دیتا ہے، حج ہجرت کا سبق دیتا ہے اور وطن کی محبت جلا دیتا ہے۔ فرمانبرداری جمعیت کا سرمایہ ہے، اس سے ملت کی کتاب کے اوراق مربوط ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ دولت کی محبت ختم کرتی ہے، نیز مساوات سے آشنا کرتی ہے۔ (قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ تم اس وقت تک نیکی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم خرچ نہ کرو گے) زکوٰۃ اس حکم پر عمل کے ذریعے دل کی تقویت کا باعث بنتی ہے، زکوٰۃ سے رزق بڑھتا ہے اور مال کی محبت کم ہوتی ہے۔ (حدیث نبوی ﷺ) یہ سب تمہاری شخصیت کو مستحکم کرنے کے ذرائع ہیں، اگر تیرا اسلام مضبوط ہے تو تیری شخصیت بھی پختہ ہے۔ ''یا قوی'' کے ورد سے صاحب قوت بن، تاکہ اپنے خاکی بدن کے اونٹ پر سواری کر سکے۔

مفہوم: اگر تو شتربان ہے (اور) اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے تو جہان پر بھی حکومت کرے گا (اور) بادشاہت کا تاج تیرے سر کی زینت بنے گا۔ جب تک یہ دنیا باقی ہے تو بھی اس کی زینت رہے گا، تو ایسی سلطنت کا تاجدار بنے گا جو کبھی زوال پذیر نہیں ہوگی۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب ہونا اور عناصر فطرت پر حکمرانی کرنا کیا خوب ہے۔ نائب حق اس کائنات کی جان کی مانند ہے، اس کا وجود اسم اعظم کا سایہ (یعنی اس کے اندر الوہی صفات منعکس ہوتی ہیں)۔ وہ جزو وکل کے جملہ رموز سے آگاہی رکھتا ہے وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہوتا ہے۔ جب وسعت کائنات میں اپنا خیمہ گاڑتا ہے، تو اس بساط کہنہ کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اس کی فطرت (افکار نو) سے معمور ہوتی ہے اور اپنا اظہار چاہتی ہے، چنانچہ وہ نیا جہان وجود میں لے آتا ہے۔ اس کے افکار کی کھیتی سے اس جہان جزو وکل کی طرح کے سینکڑوں جہان پھولوں کی مانند پھوٹتے ہیں۔ وہ ہر خام کی شخصیت کو پختہ کر دیتا ہے (اور ہر قلب کے) حرم سے بت باہر نکال پھینکتا ہے۔ اس کی مضراب سے دلوں کے تاروں سے نئے نغمے پھوٹتے ہیں، اس کا سونا جاگنا سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ وہ بڑھاپے کو جوانی کا انداز سکھاتا ہے، ہر چیز کو جوانی کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ وہ نوع انسانی کے لئے بشیر بھی ہے اور نذیر بھی، وہ سپاہی بھی ہے فوج کو منظم کرنے والا بھی اور سپہ سالار بھی۔ وہ قرآن پاک کی اس آیت کا مدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھا

دیئے۔ وہ ''اسرا'' کے بھید کا راز داں ہے۔ (یعنی وہ دنیوی و روحانی علوم سے بخوبی آشنا ہوتا ہے) اس کا سفید ہاتھ عصا سے مضبوط ہے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ید بیضا اور عصا کی طرف اشارہ ہے) اسے پورا علم اور پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ شہسوار اپنے ہاتھ میں باگ تھامتا ہے تو زمانے کے گھوڑے کی رفتار اور تیز ہو جاتی ہے۔ اس کی ہیبت سے دریا خشک ہو جاتا ہے اور وہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے جاتا ہے (یعنی غلاموں کو آزادی کی دولت سے ہمکنار کرتا ہے) اس کے قم کہنے سے مردہ جانیں قبر کے اندر اس طرح کھڑی ہوتی ہیں جس طرح باغ کے اندر صنوبر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت، جہان کی شخصیت کی توجیہہ ہے (صوفیاء انسان کو عالم اصغر کہتے ہیں)۔ اس کے جلال و عظمت پر جہاں کی عظمت موقوف ہے۔ اس کے زیر سایہ رہ کر ذرہ خورشید کی عظمت پالیتا ہے۔ اس کی قوت سے زندگی کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ وہ اپنے زور عمل کے اعجاز سے دنیا کو نئی زندگی عطا کرتا ہے (اور) وہ عمل کے نئے طور اطوار ایجاد کرتا ہے۔

مفہوم: (اس نائب حق) کے نقش پا سے کئی جلوے اٹھتے ہیں، سینکڑوں کلیم اس کے طور سینا کے مشتاق ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کی نئی تفسیر کرتا ہے، وہ اس خواب کو نئی تعبیر عطا کرتا ہے۔ اس کی پوشیدہ ہستی راز حیات ہے (اس کے ذریعے راز حیات آشکار ہوتا ہے) وہ ساز حیات کا ان سنا نغمہ ہے۔ فطرت کی مضمون نگار طبیعت بڑی جاں گسل محنت کرتی ہے، تب کہیں جا کر نائب حق کی شخصیت کے دو بیت موزوں ہوتے ہیں۔ ہماری مشت خاک پریشانی کے عالم میں آسمان تک جا پہنچی ہے۔ امید ہے کہ اب اس غبار سے وہ شہسوار ظاہر ہوگا۔ ہمارے آج کی راکھ میں ایسا شعلہ سویا پڑا ہے جو مستقبل قریب میں ہماری دنیا میں تپش و حرارت پیدا کر دے گا۔ ہمارے غنچہ کے دامن میں گلستان پوشیدہ ہے، ہماری آنکھ آنے والی صبح (کے نور) سے روشن ہے۔ (اے نائب حق) اے زمانے کے گھوڑے کے سوار آ! تو امکان کی آنکھ کا نور ہے (یعنی تجھ سے عمل کے نئے نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں)۔ اس ہنگامہ موجودات کی رونق بن، تو اس دنیا کی آنکھوں کا نور ہے، ہماری آنکھوں میں بس جا۔ اقوام عالم نے جو شورش برپا کر رکھی ہے اسے آ کر خاموش کر دے ایسا نغمہ سنا جو کانوں کے لئے لطف و سکون بنے۔ اٹھ اور دوبارہ ایسا قانون لا جو اخوت ساز ہو، ایسا جام (لا) جس کے اندر محبت کی شراب ہو۔ دنیا میں ایک بار پھر امن و امان قائم کر اور جنگجوؤں کو پھر صلح کا پیغام دے۔ نوع انسان کھیتی ہے اور تو اس کا حاصل ہے۔ تو ہی کاروان زندگی کی منزل ہے۔ ہمارے شجر ملت کے پتے خزاں کے جور و ظلم سے گر چکے ہیں، ہمارے باغ میں موسم بہار کی مانند آ۔ ہمارے بچے، جوان اور بوڑھے جو غیر اللہ کے سامنے سر بسجود ہیں، ان کی شرمسار پیشانیوں کو اس (بندگی) سے نجات دلا۔ ہم اس جہاں کے سوز میں اس لئے جل رہے ہیں تاکہ تیرے آنے سے ہم عزت و عظمت سے سرفراز ہو جائیں۔

برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی کا ایک بے لاگ تجزیہ

کے ایم اعظم

آزادی کی نصف صدی گزر جانے کے بعد ہم پہ واجب ہے کہ ہم اپنی تحریک آزادی کا ایک بے لاگ تجزیہ کریں تا کہ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے استحکام پاکستان کے لئے صحیح معنوں میں ایک مثبت اور کارگر پروگرام تشکیل دے سکیں۔ ایسا لائحہ عمل تشکیل دیتے ہوئے، ہمیں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ہوگا:

۱۔ برصغیر کے مسلمانوں کی تقدیر اور برصغیر میں اسلام کا مستقبل دو مختلف عنوان ہیں۔ ان کو آپس میں خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ دشمن کے ظلم وستم کی داستانیں دہرانے سے مسلمانوں کو ان کے مظالم سے نجات نہیں مل سکتی۔ فریاد سے قفس نہیں ٹوٹتا اور نہ ہی ہماری خودستائی ہمیں مضبوط بنا سکتی ہے۔

۳۔ یہ اشد ضروری ہے کہ کم از کم بند دروازوں کے پیچھے ہی ہم اپنا محاسبہ کر سکیں اور اپنے کردار و کارگزاری پر ایک تنقیدی نظر ڈال سکیں۔ کم از کم بند کمروں میں تو ہمیں سچ بولنے کی عادت ڈالنی چاہیے اور اسلامی جوش اور وطن پرستی کی پناہ گاہوں میں ہی گھسا نہیں رہنا چاہیے۔

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

۴۔ ہمارا رویہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر انسانی نظریہ و تصور اپنے کمال میں موجود ہے اور چونکہ ہم مسلمان ہیں اس لئے ہم میں وہ اچھائیاں بڑی حد تک موجود ہیں۔ یہ ایک غلط مفروضہ ہے کیونکہ قرآن کے الوہی اصولوں اور ہمارے کردار و اخلاق میں ایک بڑی خلیج ہے۔ اس ناقص مفروضہ کی بنا پر ہمارے مجوزہ ترقی کے نسخے کامیاب نہ ہونگے۔

۵۔ ہمیں یہ رویہ اپنا لینا چاہیے کہ کسی بھی مسئلہ کی ساری اطراف کا جائزہ لئے بغیر یا کسی بھی مقدمہ کے دونوں اطراف کے بیان سنے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں گے۔

۶۔ ہمیں کبھی حقائق کو توڑ مروڑ کر اپنے حق میں ترتیب نہیں دینا چاہیے۔ اس رویہ سے کوئی

وقتی فائدہ تو ہو سکتا ہے مگر اس کے دوررس نتائج بہت نقصان دہ ہونگے۔ بے شک ہمیں اپنی قومی استحکام کی حکمت عملی صحیح حقائق پر ہی تشکیل کرنی چاہیے۔

۷۔ ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ہمارے انگریز حکمرانوں نے اپنے مقاصد کی ترویج کے لئے ہندوستان کی مسلم تاریخ کو بری طرح سے مسخ کر دیا تھا۔ ہم کبھی بھی تاریخ کی غلط کتابیں پڑھ کر اپنے مستقبل کے بارے میں صحیح نتائج اخذ نہ کر سکیں گے۔ اس بات کی گواہی ایک ہندو دانشور، ڈاکٹر بی۔ این۔ پانڈے نے ہندوستان کی راجیہ سبھا میں 29 جولائی 1977ء کو دی تھی۔

مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ اس طویل عرصے میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں کبھی کوئی تناؤ نہ تھا اور ہر اطراف میں امن و سلامتی کا دور دورہ تھا۔ مسلمان ملوک فراخ دل، انصاف پسند، دانا، روادار اور دور اندیش تھے جبکہ ان کی رعیت ان سے مطمئن اور خوش تھی اور وہ اپنے مذہبی فرائض اور رسوم ادا کرنے میں کلی طور پر آزاد تھی۔ ہندو مسلمان ریاست کے وفادار اور قابل اعتماد شہری تھی۔ وہ اپنے مسلمان بادشاہوں کے لئے دلیری اور بے جگری سے لڑتے تھے اور ریاست کی انتظامیہ اور فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ کئی ایک مسلمان بادشاہوں کے سپہ سالار بھی ہندو راجے تھے۔ اس کے برعکس انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ کی درسی کتب میں مسلمانوں کو ہندو تہذیب و تمدن کے تباہ کاروں، مندروں کے مسمار کرنے والوں اور بت شکنوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جنہوں نے ہندو رعایا کو صرف یہ اختیار دیا تھا کہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا پھر سر کٹالیں۔

ستم ظریفی تو یہ ہے جب 1857ء کی جنگ آزادی میں ہندو مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے تو یہ ایک مسلمان تھا، جس نے جنگ آزادی کے پروانوں کو مطعون ٹھہرایا تھا۔ گو وہ ظاہری طور پر ایک پرہیز گار مسلمان تھے مگر سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت کا سبق دیا۔ انہوں نے ہندی مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ نوکریوں اور مراعات کے لئے انگریزوں سے التجا کریں، بطور حق نہ مانگیں، جیسے ان کی زندگی کا مقصد بس ان قلیل مادی مراعات کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو:

کر کلرکی، کھا ڈبل روٹی، خوشی سے پھول جا

(اکبرالہٰ آبادی)

آج کل یہ رسم بھی چل نکلی ہے کہ سر سید احمد کو دو قومی نظریہ کے موجد کے طور پر پیش کیا جانے لگا ہے۔ حالانکہ اس نظریے سے ان کا بلاواسطہ کوئی تعلق نہ تھا۔ سر سید کی 1886ء میں قائم کی ہوئی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس محب وطن ہندوستانیوں کی ایک انجمن تھی۔ سر سید احمد نے اگر کوئی سیاسی سبق دیا تھا تو وہ یہ تھا کہ مسلمانان ہند اپنی زبان اور عمل سے انگریز حکمرانوں کو یہ یقین دلا دیں کہ وہ ان کی وفادار رعیت ہیں۔ سر سید احمد کو انگریزوں اور انگریزی زبان سے اس قدر محبت تھی کہ وہ اپنے سب بچوں کے نام بھی انگریزوں کے ناموں پر رکھنا چاہتے تھے۔ ان کو افسوس یہ تھا کہ وہ فقط اپنے ایک بچے، سر راس مسعود، کو ہی انگریزی نام دے سکے۔

سر سید احمد خان شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست پرچارک رہے مگر پھر اچانک انہوں نے ہندوؤں کی عددی اکثریت کا ہوا کھڑا کر دیا اور مسلمانوں کو خود اعتمادی سے محروم بنانے اور خوف و ہراس کا شکار کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ یہاں پر ایک سوال ضرور ابھرتا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کو منتشر کرنے سے کس کے مفادات کی ترویج کر رہے تھے؟ سر سید احمد خان کو اس شے کا احساس نہ تھا کہ قوت کا دارومدار تعداد پہ نہیں، بلکہ کردار اور روحانی طاقت پر ہوتا ہے۔

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے! آتا ہے دھن جاتا ہے دھن!

(بال جبریل)

ہمارے ممدوح سر سید احمد خان سے تعبیر کی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے قوم رسول ہاشمی کی ترکیب کو اقوام مغرب پر قیاس کر کے اسے زوال سے نکالنے کا جو طریق کار مادہ پرستی، ملازمتوں کے حصول اور انگریزوں کی رضا جوئی کی شکل میں پیش کیا وہ دوراندیشی اور تاریخ کے عمیق فہم پر مبنی نہ تھا۔ سر سید اور ان کے معاونین کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی تحریک کا مہلک نتیجہ یہ نکلا

کہ مسلمانان ہند اپنے شاندار اور محترم ماضی سے آہستہ آہستہ دور ہو گئے۔ سرسید احمد نے اسباب زوال کی بنیادی حقیقت ، وہن (یعنی دنیا کی محبت اور موت کا ڈر) کو نظر انداز کر کے قوم کی مادی منفعتوں کو مطلوب و مقصود بنا لیا اور ان منفعتوں سے عارضی محرومی کو زوال کا حقیقی سبب جان لیا۔ بے شک ایسی انداز فکر سے مستقل قومی فلاح کی امید رکھنا خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ سرسید احمد اور ان کے رفقاء کی تربیت یافتہ نسل نے مسلمانان ہند کی علمی ،فکری ، روحانی اور تمدنی زندگی کی مقتدر روایات کو در خود اعتنا نہ سمجھا بلکہ مادی زندگی کی آسائشوں کو ملی زندگی کے اس قابل قدر تسلسل پر ترجیح دی۔ علی گڑھ نے حالی ،شبلی اور نذیر احمد جیسی نابغہ روزگار شخصیات تو کیا پیدا کرنی تھیں ، وہ ان اکابرین کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھانے والے حضرات بھی وجود میں نہ لا سکا۔ ایک اجنبی زبان کے ذریعے تعلیم و تدریس کے فیصلے نے برصغیر کے باشندوں کو ذہنی مرعوبیت اور مغلوبیت کا شکار کر کے ان کی تربیت کے سلسلے میں بڑی حد تک منفی کردار ادا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کا ایک فعال حصہ اپنی شاندار تاریخی روایات سے بے تعلق اور متنفر ہو گیا۔ علی گڑھ تحریک کی ابتداء جس اصلاحی جوش و خروش اور ترقی کے ولولہ سے ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ ظاہری چمک دمک ، دنیوی کامیابی اور زمانہ سازی کے جذبے کے نیچے دبتا چلا گیا۔

جلیانوالہ کے حادثہ کے دور (20-1919) میں ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا اور ہندو مسلم آپس میں شیر و شکر تھے۔ اس دور میں حضرت قائداعظم ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ مسلمان مشائخ کی تحریک ریشمی رومال میں ہندو جوش و خروش سے شامل تھے۔ یہی صورت حال تحریک خلافت کی تھی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر انگریز پریشان ہو کر اپنے مفادات کو بچانے کے لئے مستعد ہو گئے۔ انتشار ، نفاق اور نفرت و حقارت کی خوب آبیاری کی گئی ، جس نے تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔ مسلمانوں کی اکثریت خوف کا شکار ہو گئی اور ہندوؤں کی عددی اکثریت کا بھوت ان کے سر پر پھر سے سوار ہو گیا۔ یہودی نژاد وائسرائے ہند ، لارڈ ریڈنگ وزیر ہند کو اپنے 21 ستمبر 1922ء کی مراسلہ میں رقمطراز ہیں کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مکمل تفرقہ ڈالنے میں قریب قریب کامیاب ہو گئے ہیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے میں انہیں سر محمد شفیع کی بھرپور اعانت حاصل ہے ، جو کہ ایک باوقار مسلمان ہیں۔

بے شک ہندو گماشتے بھی ایسی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ بالآخر برطانوی استعمار اپنی سازش میں پوری طرح کامیاب ہوگیا۔ ہندو مسلم اتحاد قصہ پارینہ بن گیا۔ ہندو مسلم فسادات جگہ جگہ پھوٹ پڑے اور فرقہ وارانہ کشیدگیاں نفرت کے قالب میں ڈھل گئیں۔ بے شک ایک استعماری حکومت ایک محکوم ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہشمند نہیں ہوسکتی۔

حکومت برطانیہ کے سرکاری ریکارڈ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کی پالیسی ''تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو'' پر مبنی تھی۔ اس پیرائے میں دو مثالیں ہی کافی ہوں گی۔ وزیر ہند، چارلس ووڈ گورنر جنرل، لارڈ ایلگن کو رقمطراز ہیں کہ ''ہندوستان میں ہماری طاقت کا راز ایک حصے کو دوسرے حصے سے لڑانے میں ہے۔ چنانچہ ہمیں اس حکمت عملی پر قائم رہنا چاہیے۔ تمہیں اپنا پورا زور اس بات پر لگا دینا چاہیے کہ ہندوستانیوں میں کوئی مشترکہ عوامی جذبہ نہ ابھر پائے''۔ وزیر ہند جارج ہیملٹن گورنر جنرل لارڈ کرزن کو اپنے 26 مارچ 1886ء مراسلہ میں یہ مشورہ دیتے ہیں ''کہ تعلیمی درسی کتب اس طرح سے ترتیب دی جائیں کہ وہ دونوں قوموں میں اختلافات کو اجاگر کریں''۔ یہی انگریز حکمرانوں کا تاریخ ہند کو مسخ کرنے کا طریق کار تھا جس میں انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو متحارب کیمپوں میں بانٹ دیا جن کے درمیان کوئی بھی شے مشترک نہ تھی۔ ان کی اسی تقسیم نے بعد میں دو قومی نظریہ کے لئے راستہ صاف کیا۔

مقام حیرت ہے کہ کس طرح دس کروڑ جنگجو، جہادی مسلمانوں پر مشتمل قوم، جس نے ایک ہزار سال تک ہندوستان پر بلا خوف حکومت کی تھی یکدم ایک خوفزدہ اقلیت میں تبدیل ہو کے رہ گئی۔ بے شک مسلمان ہندوستان میں ایک اقلیت تھے مگر وہ ایک کمزور اقلیت نہ تھے اور ہندوستان کے مارشل شمالی صوبہ جات میں اکثریت میں تھے اور ان کی حیثیت ہندوستانی فوج اور پولیس میں ریڑھ کی ہڈی کی سی تھی۔ کتنی دردناک بات ہے کہ آج تک ہم سرسید احمد خان کی دی ہوئی عقل و مادہ پرستانہ تعلیمات کو نہیں بھولے۔ یہ انہیں کی تعلیمات کا ہی اثر تھا کہ ہم نے اپنی تحریک آزادی کی جدوجہد کی زمام بھی فرنگی پرست اشرافیہ کے طبقے کے حوالے کر دی، جو آج تک ہم پر مسلط ہیں اور ہم قیادت کی شمع اصحاب علم و فہم کے حوالے نہیں کر پائے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے بقول ہندوؤں کی عددی اکثریت کا خوف ہی مطالبہ پاکستان کی بنیادی وجہ تھی، جبکہ اسلام کے نعروں کی ضروری مگر ثانوی حیثیت تھی۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا پاکستان کی بقا ہندوؤں کے خوف اور نفرت اور اسلام کے نعروں پر ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج کل نفاز اسلام کے بلند بانگ نعرے بلند کرنے والے تقریباً سارے کے سارے قیام پاکستان کے مخالف تھے۔ سوال یہ سر اٹھاتا ہے کہ اگر ہندو کا خوف ہی تخلیق پاکستان کی بنیادی وجہ تھا تو پھر مسلمانوں کی ایک کمزور اقلیت کو ہندو اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑنا کہاں کی عقلمندی تھی۔ اسلام کی ابدی حکمت نفرت پر نہیں، عالمگیر اخوت انسانی اور محبت کی فراوانی پر مبنی ہے۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

(بانگ درا)

بے شک گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتے تھے مگر یہ بات نہرو اور پٹیل کے متعلق نہیں کہی جاسکتی، جن کا مفاد ایک طاقتور فیڈرل حکومت کی آزادانہ سربراہی میں تھا۔

1946 کے اواخر میں برطانیہ کی فیڈرل حکومت کی لیبر گورنمنٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ اِن کا مفاد اب ہندوستان کو تقسیم کر کے بھاگ جانے میں ہے۔ اِس تبدیل شدہ حکمت عملی کو عملی جامعہ پہنانے کے لئے ہندوستان کی وائس رائلٹی ایماندار اور راست گو لارڈ ویول سے بے ایمان، چالاک اور دروغ گو ماؤنٹ بیٹن کو تفویض کر دی گئی۔ ماؤنٹ بیٹن کو آزاد ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل نامزد کرانے میں ان کی بیگم ایڈوینا نے جو رول ادا کیا وہ آپ تاریخ کا حصہ ہے۔ پاکستان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور ماؤنٹ بیٹن کے خلاف قانون مجوزہ انڈین یونین کے مفادات اپنے بنا لئے اور وہ پاکستان کو ہر قسم کا نقصان پہنچانے پر کمر بستہ ہو گئے۔ حالانکہ شاہ برطانیہ کے نمائندہ ہوتے ہوئے انہیں ایسا بالکل نہیں کرنا چاہیے تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس جو 9 جولائی **1947**ء کو دہلی میں منعقد ہوا میں چند مسلم لیگ کے قائدین نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن کا کٹھا پھٹا پاکستان تو ہم چار سال

پہلے کانگریس کے ساتھ گفت وشنید کر کے حاصل کر سکتے تھے (اور اس طرح اس خون خرابے سے بھی بچ جاتے جو بعد میں ہوا)۔ بے شک اس بے تحاشا قتل وغارت اور کثیر انتقال آبادی کا نہ تو ہمارے قائدین کو اور نہ ہی ہمارے عوام کو اندازہ تھا۔

ہمیں اِس سوال کا جواب بھی مہیا کرنا ہوگا کہ کیا قائداعظم پاکستان کے حالات سے مایوس ہو گئے تھے؟ زیارت میں جناب لیاقت علی خان سے آخری ملاقات کے بعد ان کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے تھے؟ کیا قائداعظم کا واقعی یہ خیال تھا کہ پاکستان شاید ایک عارضی واقعہ ہو اور بالآخر ہندوستان اور پاکستان شاید ایک ہو جائیں (ٹرانسفر آف پاور، جلد X، صفحہ 281)۔ 29 اپریل 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ایک میٹنگ میں قائداعظم نے متحدہ بنگال کی تجویز کی حمایت کی تھی (ایضاً صفحہ 452)۔ قائداعظم نے سکھوں کو بھی پاکستان کے اندر ایک خود مختاری سیاسی یونٹ کی پیشکش کی تھی۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلم لیگ کانگرس کی طرح اپنے مفادات کا تحفظ نہ کر سکی۔ نہ ہی اس نے لارڈ ویول کی برخاستگی پر کوئی شور مچایا اور ماؤنٹ بیٹن کی فتنہ پردازیوں کو بھی خاموشی سے سہہ لیا۔ مسلم لیگ کو یہ پتہ ہونا چاہئے تھا کہ انگریز اقتدار دونوں پارٹیوں کو منتقل کئے بغیر ہندوستان سے نہیں جائے گا اور اِس امر واقعہ کو اِس کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہئے تھا۔ اِس کو صوبوں یا کم از کم ضلعوں کی تقسیم پر تو کسی حالت میں بھی رضامند نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مگر اس کے برعکس مسلم لیگ کا رویہ یہ تھا کہ ہمیں پاکستان دے دو خواہ صرف سندھ کے ریگستانوں پر مشتمل ہو (ایضاً صفحہ 270)

اگر لارڈ ویول ہندوستان کا وائسرائے رہتا تو اِس کی بریک ڈاؤن پلان کے تحت بالآخر پاکستان کو پورا پنجاب، بنگال اور آسام مل جانا تھا اور اِس طرح کشمیر بھی پاکستان میں شامل ہوتا۔ کیبنٹ مشن پلان کے تحت بھی یہ صوبے مسلمان ریاستوں کے حصے میں آتے تھے۔ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے یہ پلان منظور کر لیا تھا مگر بعد میں جواہر لال نہرو نے کانگرس کی صدارت سنبھالنے پر جولائی 1947ء میں اِس پلان کو سبوتاژ کر دیا۔ بعد میں کانگر نے اپنی مشروط رضامندی کا اظہار کر دیا جو مسلم لیگ نے قابل اعتنا نہ سمجھا۔ بہرحال اگر کیبنٹ مشن پلان پر عمل ہو جاتا

تو ہمیں بالاخر پورے پنجاب، بنگال اور آسام پر مشتمل پاکستان اور کشمیر مل جاتا۔ مزید برآں ہم بے جا ہنگاموں، بے تحاشا قتل و غارت اور بے پناہ انتقال آبادی کے اضطراب سے بچ کر آپس میں خوش خلق ہمسایوں کی طرح دوستانہ ماحول میں رہ سکتے تھے۔

اِن حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک سخت گیر تاریخ دان تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان میں بیسویں صدی میں مسلمانوں کی کوئی بھی منظم اور منزل آشنا تحریک آزادی نہ تھی۔ مسلمانوں کو فقط وہی کچھ ملا، جو انگریز ہندوؤں سے ان کے لئے حاصل کر سکے۔ پروفیسر شریف المجاہد کے بقول ''مسلمانانِ ہند سر سید احمد کے دور سے اور ان کے بعد کی پانچ دہائیوں میں بنیادی طور پر ہندوؤں کے اُبھرتے ہوئے نسلی اور تمدنی شعور کے خلاف ردعمل کر رہے تھے''

اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ہندوستان کے جرائم کی داستانیں دہرانے سے ہندوستان اور کشمیر کے مسلمانوں کو اِس کے مظالم سے نجات نہیں مل سکتی اور نہ ہی خود ستائی ہمیں دشمن کی چالوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ آزادی کے اِن پچاس سالوں میں ہماری طرح ہندوستان بھی انحطاط کا شکار ہوا ہے اور ہر ہندو کی روح پر مسلمان نفرت نے غلبہ پا لیا ہے اور اور اِسلام کا بھوت اِن کے سر پر سوار ہو گیا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے اِس موڑ پر ایک معجزہ ہی ہم کو باہمی تباہی سے بچا سکتا ہے۔ بہر حال ہندوستان کو ایک دائمی دشمن کا درجہ دینا بھی کوئی مثبت رویہ نہ ہوگا۔ ہمارا مفاد تو بس اِسی میں ہو سکتا ہے کہ ہم طاقتور اور متحد ہوں اور باہمی اور عالمی حالات کا رخ اپنے حق میں موڑ دیں خواہ اس کے لئے ہمیں ہندوستان سے مشروط مفاہمت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ ہندوستان کو چاہئے کہ وہ دنیا میں ظہور پذیر ہوتے ہوئے حالات کو اِن کے صحیح تناظر میں دیکھے وگرنہ جہاں تک مغرب کا تعلق ہے، ان کو اس کا رتی بھر بھی قلق نہ ہوگا کہ ہمارے دونوں ممالک اپنے آپ کو ایک نیوکلیائی بیابان میں تبدیل کر لیں۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

بانگ درا

اختلافی مسائل اور ان کا نقطہ عدل

صدرالدین اصلاحی

اب ذرا ان اختلافات کی اصلیت پر غور کرو جن پر فرقہ بندیوں کا محاذ جنگ قائم ہو رہا ہے اور دیکھو کہ صحابہ' تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ سلف نے ہمارے لیے کون سا اسوہ چھوڑا ہے؟ ان تمام کا یہ حال تھا کہ ان میں بعض لوگ بسم اللہ پڑھتے تھے اور بعض لوگ نہیں پڑھتے تھے۔ اگر ان میں ایک جماعت ایسی تھی جو قے کرنے اور پچھنے لگوانے کے بعد تجدید وضوء کو ضروری خیال کرتی تھی تو ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس کی مطلقا ضرورت نہ سمجھتی تھی۔ یہ اور اسے قسم کے بیسوں اختلافات موجود تھے لیکن اس کے باوجود وہ سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ کسی نے کسی کی اقتداء سے کبھی انکار نہیں کیا۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ اور امام شافعی وغیرہ مدینہ والوں کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ اہل مدینہ سرے سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے نہ آہستہ اور نہ زور سے۔ امام ابو یوسف نے ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھی، حالانکہ اس نے حجامت پچھنے لگوانے کے بعد وضوء کی تجدید نہیں کی تھی۔ امام ابو یوسف کے مذہب میں پچھنوں کے بعد تجدید وضوء لازم ہے۔ مگر امام مالک کے مذہب میں لازم نہیں ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل حجامت اور نکسیر کو ناقص وضو مانتے تھے لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اس ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے جس نے بدن سے خون نکلنے کے بعد وضو نہ کیا ہو، تو آپ نے جواب دیا، یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ امام مالک اور سعید بن المسیب کے پیچھے نماز نہ پڑھوں؟ (جن کے نزدیک یہ چیزیں نواقص وضو نہیں ہیں) روایت ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد عیدین میں خلیفہ ہارون کی رعایت سے حضرت ابن عباس کے مذہب کے متعلق تکبیریں کہا کرتے تھے۔ حالانکہ ان دونوں اماموں کا مذہب اس کے خلاف تھا۔ امام شافعی نے مقبرہ امام ابوحنیفہ کے قریب فجر کی نماز پڑھی تو محض ان کے لحاظ اور ادب سے دعائے قنوت کو ترک کر دیا اور فرمایا کہ بسا اوقات ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں۔ امام ثانی (امام ابو یوسف) کے متعلق البزازیہ میں ہے کہ آپ نے جمعہ کے روز حمام میں غسل کیا اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز پڑھ کر جب ادھر ادھر منتشر ہو گئے تو آپ کو اطلاع دی گئی کہ حمام کے کونے میں ایک مرا ہوا چوہا موجود

ہے امام موصوف نے یہ سن کر فرمایا' تو اس وقت ہم اپنے مدنی بھائیوں کے مسلک پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی دو قلہ کی مقدار میں ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا اس کا حکم ماء کثیر کا ہو جاتا ہے۔ امام نجندی سے پوچھا گیا کہ اگر ایک شافعی المذہب آدمی نے دو ایک برس کی نماز چھوڑ دی ہو اور اس کے بعد وہ حنفی مذہب اختیار کر لے تو پھر وہ کس طرح نماز کی قضاء کرے؟ آیا امام شافعی کے مذہب کے مطابق یا حنفی مذہب کے مطابق؟ جواب دیا کہ جس مذہب کے مطابق اس نے قضاء کر لیا جائز ہے بشرط کہ اس کے جواز کے اعتقاد رکھتا ہو۔ جامع الفتاوہ میں ہے کہ اگر کسی حنفی نے یہ کہا کہ اگر میں فلاں عورت سے نکاح کر لوں تو اس پر طلاق اس پر طلاق (یعنی تین طلاقیں دیں) پھر اس نے کسی شافع المذہب فقیہ سے فتوہ پوچھا اور اس نے جواب دیا کہ اس پر طلاق نہ پڑے گی اور تمہاری یہ قسم لغو مانی جائے گی۔ تو اس مسئلہ میں امام شافعی کے اقتداء کرنے میں اس کے لئے کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اکثر صحابہ کرام کی تائید اسی مسلک کو حاصل ہے۔ امام محمدؒ نے اپنی امالی میں فرمایا ہے کہ اگر کوئی فقیہ اپنی بیوی کو ان لفظوں میں طلاق دے،،

اور وہ اپنے مذہب کے مطابق ایسی طلاق کو تین طلاق یعنی طلاق بائن سمجھتا ہو لیکن قاضی وقت فیصلہ کر دے کہ یہ طلاق رجعی ہے تو اس کے لئے رجعت کرنے کی گنجائش ہے۔ اس طرح تحریم و تحلیل اور معاشرہ اور لین دین کے ان تمام معاملات میں جن کے اندر فقہاء اور ائمہ کی رائے مختلف ہے ہر فقیہ پر لازم ہے کہ اگر دارالقضاء سے اس کے مذہب فقہی کے خلاف فیصلہ ہو تو وہ اپنی رائے اور اپنے مسلک کو چھوڑ کر قاضی کے فیصلہ پر عمل کرے۔ چند مسائل اور ہیں جن کی اصلیت کے بارے میں ایک عام اور عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ اور درحقیقت یہی غلط فہمی موجودہ اختلافات کا سرچشمہ ہے ہم انہیں یہاں نمبر وار بیان کرنا چاہتے ہیں۔

ا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقہ کی وہ تمام تفریعات جو ان لمبی لمبی شرحوں اور فتاوی کی موٹی موٹی کتابوں میں موجود ہے۔ سب کی سب امام ابو حنیفہ اور صاحبینؒ کے اقوال ہیں۔ وہ ان اقوال میں یہ تمیز نہیں کرتے کہ فلاں قول ان آئمہ کا واقعی قول ہے اور فلاں قول ان کی رایوں اور فتوؤں کو سامنے رکھ کر بعد میں مستنبط کیا گیا ہے۔ اور یہ جو ان کتابوں میں تخریج کذا اور تخریج الطحاوی کذا کے الفاظ آیا کرتے ہیں ان کو گویا بے معنی سمجھتے ہیں اسی طرح قال ابو حنیفہ کذا (امام ابو حنیفہ نے

یوں فرمایا) امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق مسئلہ کا جواب یوں ہے) کہ درمیاں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے اور ابن الحمام اور ابن النجیم وغیرہ محققین حنفیہ کا مسئلہ دہ در دہ اور مسئلہ تیمم اور ایسے دوسرے مسائل کے بارے میں یہ فرمانا کہ دراصل یہ امام ابوحنیفہ کا قول نہیں ہے بلکہ بعد والوں کی تخریجات ہیں "ان کے نزدیک بالکل ناقابل اعتناء ہے۔ اسی طرح بعض ارباب علم و حیثیت اس وہم میں مبتلا ہیں کہ مذہب حنفی کی بناء انہی جدلی بحثوں پر قائم ہیں۔ جو المبسوط، ہدایہ اور التبیین کے صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں وہ نہیں جانتے کہ ان کے مذہب کی بناء ان بحثوں پر نہیں ہے بلکہ اس طریق بحث وجدل کے بانی دراصل معتزلہ ہیں جسے متاخرین نے اس خیال سے اختیار کر لیا تھا کی اس سے طلبہ کے ذہن میں تیزی اور وسعت پیدا ہوگی۔ اگرچہ ان کی تمنا بار آور نہ ہو سکی اور ان کے اس طرز عمل نے جلا اور وسعت دینے کے بجائے انہیں بے بصیرتی اور تعصب کی تنگنائیوں میں گھیر کرنا کارہ بنا دیا ہم اس جگہ ان اوہام اور شکوک کی تردید میں لمبی گفتگو نہیں کرنی چاہتے کیونکہ اس بات کی تمہید میں جو کچھ ہم بیان کر چکے ہیں اس کی روشنی ان میں سے اکثر کا خود بخود ازالہ کر دیتی ہے۔

۲۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کی اساس وہ اصول ہیں جو اصول بزدوی وغیرہ کتابوں میں درج ہیں۔ حالانکہ ان میں سے اکثر اصول ایسے ہیں جن کا ذکر ان بزرگوں نے کبھی نہیں کیا۔ بلکہ وہ ان کے اقوال و فتاوی کو سامنے رکھ کر بعد میں وضع کئے گئے ہیں۔ مثلاً میرے نزدیک فقہ کے حسب ذیل اصول آئمہ کے کلام سے بعد والوں نے نکالے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ یا صاحبین سے کوئی صحیح روائت ایسی منقول نہیں جس میں یہ اصول مذکور ہوں "خاص اپنے حکم میں خود واضح اور مبین ہے اس کے ساتھ کوئی تشریحی بیان ملحق نہ کیا جائے گا"

"کسی حکم پر اضافہ اس حکم کا نسخ ہے"

"خاص کی طرح عام بھی قطعی ہے"

"کثرت رواۃ لازمہ ترجیح نہیں"

"غیر فقیہ راوی کی روایت اگر اصول و قیاس کے خلاف ہو تو واجب العمل نہیں"

"مفہوم شرط اور مفہوم وصف کا کوئی اعتبار نہیں"

اس قسم کے بہت سے اصول فقہی ایسے ہیں جن کی تعیین وتفریح سے آیمہ کا کوئی تعلق نہیں اور ایسے اصولوں کی محافظت کرنا اوران پر وارد ہونے والے اعتراضات کو بڑے تکلفات کے ساتھ رفع کرنا متقدمین کا طریقہ نا تھا۔ ان کی محافظت ومدافعت ہماری توجہ کی صرف اسی قدر مستحق ہے جس قدر ان کے خلاف اصول وقوائد فقہ کی۔ اگر ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے میں تکلف سے کام لیا جائے جیسے کہ عام لوگوں کا شیوہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اصول کو جوش حمایت سے محروم رکھا جائے۔

اب ہم چند مثالیں دے کر اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں:

ا۔ ان حضرات نے یہ اصول قرار دیا ہے کہ "لفظ خاص اپنے حکم میں خود واضح ہے۔ کسی تشریحی بیان کو اس کے ساتھ ملحق نہ کیا جائے گا" یہ قائدہ دراصل متقدمین کے اس فعل سے نکالا گیا ہے کہ انہوں نے آیت کی بناء پر نماز میں صرف رکوع وسجود کو فرض قرار دیا اور اطمینان کو فرض نہیں ٹھرایا درآنحالیکہ حدیث میں یہ ارشاد موجود تھا کہ،، آدمی کی نماز نہیں ہوتی جب تک وہ رکوع وسجود میں اپنی پیٹھ کو پوری طرح ٹھیرائے نہیں،، اس ایک معاملے میں متقدین نے جو مسلک اختیار کیا متاخرین نے اس سے ایک قائدہ وقلیہ وضع کر لیا۔ مگر دیکھو کہ متعدد معمولات میں وہ خود مقرر کئے ہوئے اس قائدے کو کس طرح توڑتے ہیں:

آیت وامسحوا برؤسکم میں محض سر پر مسح کرنے کا حکم ہے۔ اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ کا لفظ خاص ہے، قائدہ مذکورہ کی روح سے چاہئے تھا کہ سر کے مسح کی مطلق فرضیت کا فتوی دیا جاتا۔ لیکن حنفیہ اپنے اس قائدے کی پابندی نہیں کرتے اور اس حدیث کی بناء پر جس میں مذکور ہے کہ آنحضور ﷺ نے ناصیہ کا مسح فرمایا، مسح کے لیے سر کے چوتھائی حصے کی حد مقرر کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہاں حکم خاص کے ساتھ اس کی تشریح کو کیوں ملحق کیا گیا؟

قرآن کا حکم ہے اور لفظ خاص کے ساتھ ہے کہ "زانی اور زانیہ کو کوڑے مارو" مذکورہ بالا قائدہ کا اقتضا تھا کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ سب کو ہی کوڑے مارنے کی سزا دی جاتی۔ مگر یہی احناف حدیثوں کو اس آیت کے متعلق مانتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ غیر شادی شدہ کو تو

کوڑے مارے جائیں، لیکن شادی شدہ مجرم کو سنگسار کر دیا جائے۔ کیا یہ لفظ خاص کے ساتھ تشریح کا الحاق نہیں؟ آیت، میں مطلقا چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے، قائدہ مذکورہ کے مطابق چاہئے تھا کہ ایک پیسے کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹ ڈالا جاتا۔ لیکن اپنے مقرر کئے ہوئے اصول کو بالائے طاق رکھ کر انہی حضرات نے دس درہم کی شرط لگائی اور حدیث کو آیت کا بیان قرار دیا۔

طلاق مغلظ دینے کے بعد اگر شوہر از سر نو مطلقہ کو اپنے نکاح میں لانا چاہے تو قرآن، ان الفاظ کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ یہ صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب کہ اس کی طلاق دینے کے بعد کوئی دوسرا شخص اس عورت سے نکاح کر چکا ہو۔ اس حکم کا لفظ یعنی، تنکح، خاص ہے جو اپنے متعارف مفہوم میں ایجاب وقبول تک محدود ہے۔ پس آیت سے صرف اتنی شرط نکلتی ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح بمعنی ایجاب وقبول کر لے لیکن فقہائے احناف نے حدیث، کو اس حکم کا بیان تسلیم کر کے نکاح کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی ہے کہ دوسرا شوہر اس عورت سے جماع بھی کر لے۔

بتاؤ ان مثالوں میں اصول "**الخاص مبین لا یلحقه البیان** " کا کتنا لحاظ کیا گیا ہے؟

(ب) قرات نماز کے متعلق نص قرآنی "**فاقرء واماتیسر من القرآن** " میں، **ماتیسر**، کا عموم چاہتا ہے کہ جتنا بھی اور جہاں سے بھی قرآن پڑھ لیا گیا نماز ہو جائے گی اور حدیث "**لاصلوۃ الابفاتحه الکتاب** " کا ظاہری مفہوم چاہتا ہے کہ سورۃ فاتحہ کی قرات ہر رکعت میں فرض ہے۔ لیکن قدما نے آیت کے عموم کو اپنی جگہ رکھا اور حدیث کو اس کا مخصص نہ مانتے ہوئے فتوہ دیا کہ قرات فاتحہ فرض نہیں ہے۔ اسی طرح کے بعض اور اقوال سے متاخرین نے ایک قلی اصول یہ مستنبط کرلیا کہ "**العام قطعی کالخاص** " یعنی لفظ عام بھی اپنے حکم اور مفہوم میں خاص کی طرح قطعی ہوتا ہے۔ اس کا عموم تخصیص کا متحمل نہیں بلکہ وہ ایک مستقل عمل ہوتا ہے۔

اس اصول کا تقاضہ تھا کہ آیت "**فما استیسر من الھدی** " کہ عموم کو بھی قطعی مان کر کہا جاتا کہ ہر چھوٹی بڑی فدی جو بھی با آسانی میسر آ سکے قربانی کے کام آ سکتی ہے کیونکہ،

فما استیسر ،کالفظ عام ہے اس لئے اس کے مدلول اور مقصود میں بھی عموم اور وسعت باقی رکھنا چاہیے۔ لیکن احناف حدیث سے خود ہی تخصیص فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حدی کے لیے بکرا یا بکرے سے بڑا کوئی جانور ہونا چاہیے۔ کیا یہاں لفظ عام کی قطعیت خاص کی طرح قائم رہی؟

(س) اصول فقہ کی ایک محکم دفعہ یہ بھی ہے کہ **"لاعبدة بمفهوم الشرط والوصف"** یعنی اگر کوئی حکم کسی خاص موقعہ پر دیا گیا ہو تو اس حکم کے اطلاق میں اس خاص موقعہ کی خصوصیات اور شرائط کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ یہ قاعدہ دراصل سلف کے اس مسلک سے نکالا گیا ہے جو انہوں نے آیت **"فمن لم يسطع منكم طولا"** کے بارے میں اختیار کیا ہے۔ اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور بوجہ ناداری اس کے اخراجات کے متکفل نہیں ہو سکتے وہ لونڈی سے نکاح کر سکتے ہیں لیکن متقدمین نے اس شرط عدم استطاعت کو قید جواز نہ مانتے ہوئے زی استطاعت اور صاحب مقتدرت انسان کو بھی لونڈی سے نکاح کی اجازت دے دی۔ ان کے اس فتویٰ سے مندرجہ بالا اصول منضبط کر لیا گیا لیکن اونٹ کی زکوٰۃ کے بارے میں یہ لوگ خود اس اصول کو توڑ دیتے ہیں۔ نص کے الفاظ، ہیں جن میں یہی قید شرط مذکور ہے۔ اصول مذکورہ کے لحاظ سے چاہیے تھا کہ سائمہ اور غیر سائمہ ہر نوع کے اونٹوں میں زکواۃ فرض قرار دی جاتی اور اس لفظ السائمہ کے مفہوم سے حکم کو مقید نہ کیا جاتا مگر ایسا نہیں کیا گیا اور صرف چرنے والے اونٹوں میں زکواۃ کی فرضیت کا فتوی دیا گیا۔

(د) حدیث مصراہ جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے میں آئمہ صلف نے جو مسلک اختیار کیا تھا اس کے پیش نظر متاخرین نے یہ قلی اصول بنالیا کہ جب کوئی غیر فقیہ راوی کسی ایسی حدیث کی روائت کرے جو قیاس سے متصادم ہوتی ہو تو وہ واجب العمل نہ ہوگی مگر انہیں واضعین اصول نے حدیث قہقہہ کو جو خلاف قیاس بھی ہے اور غیر فقیہ راوی کی روایت بھی، واجب العمل مانا اور فتویٰ دیا کہ نماز میں با آواز بلند ہنسنے سے نماز ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ حالانکہ وضو اور قہقہہ کا کوئی تعلق معنوی اب تک دائرہ قیاس میں نہیں آسکا۔ اور اسی طرح افطار صوم کے بارے

ہیں یہ بھی اصول پس پشت ڈال دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جب کھانا پینا روزہ کو توڑ دیتے ہیں تو چاہے بھول کر کھایا جائے یا عمداً بہر حال روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن اس کھلے ہوئے قیاس کو انہوں نے ایک ایسی حدیث کی وجہ سے ترک کر دیا۔ جو خلاف قیاس بھی ہے اور غیر فقیہ راوی کی روایت بھی۔

صاحب نظر کے لیے چند اشارات کافی ہیں ورنہ اس کے شواہد بے شمار ہیں جو بتاتے ہیں کہ ان اصولوں کی حقیقت کیا ہے، اور خود ان کے واضعین نے کس طرح ان کی خلاف ورزی کی ہے۔ پھر جب اس خلاف ورزی پر اعتراض کیا گیا تو اس کا جواب انہوں نے جن تکلفات اور سخن پروریوں کے ساتھ دیا ہے ان کی داستان بھی ہر ناظر ان کی کتابوں میں دیکھ سکتا ہے۔ مسئلہ کی اصل حقیقت بالکل بے نقاب ہو سکتی ہے اگر تم صرف ایک ہی قائدے کے متعلق علماء محققین کی تصریحات دیکھ لو۔ وہ فرماتے ہیں کہ شرط فقاہت والے اصول میں دو مذہب ہیں۔ ایک تو عیسیٰ ابن ابان کا جن کے نزدیک غیر فقیہ راوی کی روایت ضابط اور عادل ہونے کے باوجود خلاف قیاس ہونے کی صورت میں ناواجب العمل ہے، اور اکثر متاخرین نے اسی رائے کو اختیار کر لیا ہے۔ دوسرا مذہب امام کرخی کا ہے جن کے نزدیک خبر واحد کے قیاس پر مقدم ہونے کے لئے راوی کا فقیہ ہونا شرط نہیں۔ حدیث بہر حال قیاس کے مقابلے میں واجب الاتباع ہے۔ بہت سے علماء نے اسی دوسری رائے کو مانا ہے چنانچہ وہ صاف لفظوں میں فرماتے ہیں کہ یہ قول (یعنی قول اول) ہمارے آئمہ سے منقول نہیں۔ ان سے تو یہ منقول ہے کہ خبر واحد قیاس پر مقدم ہوگی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ انہوں نے بھول کر کھانے سے روزہ نہ ٹوٹنے کے متعلق حضرت ابو ہریرہ کی روائت کو واجب العمل تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ روایت قیاس کے خلاف تھی۔ یہاں تک کہ امام ابو حنیفہ نے صریحاً فرمایا کہ اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو میں قیاس کو اختیار کرتا۔

خود ان متاخرین کا اکثر تخریجات میں مختلف ہونا اور ایک دوسرے پر اعتراض کرنا ہمارے خیال کی ایک ناقابل تردید شہادت ہے

۳۔ ایک غلط فہمی اور ہے جس کا ازالہ ضروری ہے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقاہت کے لحاظ سے محض دو گروہ ہیں۔ ایک اہل الظاہر دوسرے اہل الرائے۔ اور جو شخص بھی قیاس اور استنباط سے کام لے وہ اہل الرائے میں سے ہے۔ حاشا کہ حقیقت سے یہ انتہائی بے خبری ہے۔ لفظ "رائی" کا

مفہوم نا تو نفس عقل وفہم ہے کیونکہ کوئی عالم اس صفت سے عاری نہیں نہ رائے کا مطلب وہ رائے محض ہے جس کا رشتہ سنت سے منقطع ہو کیونکہ ایسی رائے کوئی متبع اسلام اختیار نہیں کر سکتا۔ اور نہ رائے سے مقصود قیاس واستنباط کی قدرت ہے کیونکہ امام احمد اور اسحاق بلکہ امام شافعی کا بھی بالاتفاق اہل رائے میں شمار نہیں حالانکہ وہ قیاس سے بھی کام لیتے ہیں اور مسائل کا استنباط بھی کرتے ہیں۔ رائی اور اہل الرائی کا مفہوم ان تمام سے جداگانا ہے۔ اہل الرائے کہتے ہیں ان لوگوں کو جنہوں نے جمہور مسلمین کے متفق مسائل کے بعد فروعی اور اختلافی مسائل میں کسی امام کے اقوال واصول کو سامنے رکھ کر تخریج واستنباط پر اکتفاء کر لیا، اور روایات وآثار کے تتبع سے تقریباً بے نیاز ہو کر اصول اور قیاس کی مدد سے جزءیات نکالنے لگے۔ وہ حل مسائل کے وقت نصوص آثار وسنن کی طرف مراجعت کرنے کی بجائے زیادہ تر یہ دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ فقہاء کے ٹھیرائے ہوئے اصول میں سے کس اصول کے تحت آتا ہے، اس کے اشباہ ونظائر کیا ہیں، کس مسئلہ کی علت اس میں پائی جاتی ہے۔ ان کے مقابلے میں ظاہر یہ وہ لوگ ہیں جو نہ قیاس سے کام لیتے ہیں اور نہ آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے، جیسے امام داود اور ابن حزم ان دونوں گروہوں کے درمیان محققین اہل سنۃ کا گروہ ہے جیسے امام احمد واسحاق“۔

یہ بحث اگرچہ اس تفصیل واطناب کے ساتھ عنوان کتاب سے خارج تھی لیکن اس کے باوجود مذہبی فرقہ آرائیوں کی موجودہ خلفشار اور حقیقت حال سے عام بے خبری کو دیکھ کر میں نے یہ ضروری سمجھا کی عدل وتوسط کا نقطہ جو ان ہنگاموں میں گم ہو گیا ہے اس کو افراط وتفریط اور تعصب کی الجھنوں سے نکال کر ارباب نظر کے سامنے پیش کر دوں۔ عدل پسند اور حق طلب کے لئے یہی کافی ہے۔ متعصب کے لئے کچھ بھی کافی نہیں۔ **وربنا الرحمن المستعان علی ما تعفون**

چند واقعات جن پر یقین کرنا ضروری نہیں

ڈاکٹر انور سدید

مجھے یقین تو نہیں آتا لیکن جھاڑ پھونک کا یہ واقعہ سید مسعود زاہدی نے ''میری کہانی'' میں لکھا ہے جو ان کی خود نوشت سوانح ہے جو اس پس منظر میں لکھی جا رہی ہے کہ ''پاکستان کا مطلب کیا''۔

سید مسعود زاہدی ان دنوں پی آئی تھے۔ لکھتے ہیں ''خوشاب میں ایک دن میری ضعیف ملازمہ نے شور مچا دیا'' مجھے بچھو نے کاٹ لیا ہے بڑی بی کا ہاتھ پکڑ کر ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ گلی کی نکڑ پر ایک صاحب ملے۔ ''کورٹ صاحب اجازت ہو تو میں جھاڑ دوں؟'' بڑی بی شور مچاتی وہیں بیٹھ گئی، گویا ڈاکٹر سے جھاڑ پھونک بہتر ہے۔ وہ شخص اندر سے ایک لمبی چھری لے کر آیا اور بڑی بی کے پاس بیٹھ کر چھری سر سے پیر تک چھوائی، تین مرتبہ ایسا کیا۔ بڑی بی سے پوچھا.... ''ٹھیک ہو؟'' انہوں نے کہا تیرے بچے جئیں، دودھوں نہائیں، پوتوں پھلیں، میں بالکل ٹھیک ہوں....'' اس دوران میں بڑی بی کی حالت دیکھتا رہا۔ پوچھا ''بڑی بی ڈاکٹر کے پاں لے چلوں؟'' بڑی بی بولی کورٹ صاحب کوئی ضرورت نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔

جھاڑ پھونک کا دوسرا نرالہ تجربہ بھی سید صاحب نے ہی بیان کیا ہے۔

''میں ڈپٹی کمشنر چودھری بشیر تارڑ کی عدالت میں بحث کر رہا تھا کہ ایک شخص شور مچاتا ہوا آیا۔ ''جی میرے باپ کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ ڈی سی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ زور کا تھپڑ مارا اور کہا'' جا وہ ٹھیک ہو گیا ہے'' میں بحث چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ جا کر دیکھا کہ باپ ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ تھپڑ مار کر سانپ کا زہر مارنا اس گھر کی ریت بن گئی ہے۔

جھاڑ پھونک کے ان دو محیر العقل واقعات کے بعد اب ''دم و درود'' کا ایک واقعہ سنئے۔ جس کا میں چشم دید شاہد ہوں۔ ہمارے محلے کی مسجد میں استاد ابراہیم موذن تھے۔ وہ کچھ قرآنی آیات پڑھ کر آدھے سر کا درد رفع کرتے تھے۔ ایک دن ہمارے گھر ایک مہمان خاتون رشتہ دار آئیں جنہوں نے سر کو دوپٹے سے باندھ رکھا تھا اور آدھے سر کے درد سے کراہ رہی تھیں۔ والد صاحب نے موذن استاد ابراہیم کو بلا کر گزارش کی کہ اس خاتون کو دم کر دیں استاد ابراہیم وضو کر

کے آئے، اور دائیں ہاتھ سے خاتون کا سر پکڑا۔ زیر لب کچھ بڑبڑائے۔ تیسری مرتبہ بڑبڑانے کے بعد کہا ''اب سر جھٹک دو''۔ بی بی جو درد کی شدت سے تڑپ رہی تھی، اب صحت یاب ہو کر دعائیں دینے لگی۔ میں نے ایک دن استاد ابراہیم سے گزارش کی کہ ''مجھے بھی یہ دم سکھا دو'' انہوں نے چند آیات بتا دیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں ان آیات کی خاموش تلاوت کر کے اور تین مرتبہ استاد ابراہیم کے اسلوب میں آدھے سر کے درد کے مریض کو سر جھٹکنے کے لئے کہتا ہوں تو درد کم ہونے کے بجائے زیادہ ہو جاتا ہے۔ زچ ہو کر مریض کو استاد ابراہیم کے پاس لے جاتا تو اپنے عمل سے اسے صحت یاب کر دیتے، ہنس کر کہتے'' کاکا تمہارا عمل خام ہے''۔

اب ایک اور واقعہ ذہن میں آ رہا ہے۔ جس سے میں اب تک استفادہ کر رہا ہوں۔

فیصل آباد میں مجھے حافظ آباد اری گیشن ڈویژن کا چارج دیا گیا تھا۔ سالانہ ترقیاتی پروگرام میں میرے ڈویژن کی پراگرس معمول سے زیادہ لیکن ایک پڑوسی ڈویژن کی پراگرس کم تھی۔ چیف انجینئر صاحب نے اس ڈویژن کے ایگزیکٹو انجینئر کو تبدیل کر کے اس ڈویژن کا دوسرا چارج بھی مجھے دے دیا۔ میں نے اس ڈویژن کے اے ڈی پی کی پراگرس بہتر کرنے کی کوشش کی اور مجھے کچھ کامیابی بھی ہوئی لیکن جب حافظ آباد اور فیصل آباد دونوں ڈویژنوں کی پراگرس جمع کی جاتی تو وہ معینہ تناسب سے کم نکلتی تھی اس پر چیف انجینئر نے مجھے چارج شیٹ کرا دیا جس سے گریڈ 19 میں میرا موو اوور (Move Over) رک گیا۔ میں پریشان تھا کہ پڑوسی ڈویژن کے ایگزیکٹو انجینئر کی بلا میرے گلے میں پڑ گئی تھی، ایک شام میں دورے پر سالار والا کے قریب سے گزر رہا تھا کہ میرے دل میں اس چھوٹے سے قصبے میں صوفی برکت علی صاحب کی مسجد میں نماز مغرب پڑھنے کا خیال آ گیا۔ وہیں میری ملاقات ایک سابق سب انجینئر عبدالغفور سے ہوئی جو ملازمت چھوڑ کر صوفی صاحب کی خدمت میں مستقل حاضر ہو گئے تھے۔ نماز مغرب کے بعد عبدالغفور صاحب نے ہی میرا تعارف صوفی صاحب سے کرایا۔ صوفی صاحب میری طرف متوجہ ہوئے تو فرمایا:

''زیادہ فکر نہ کرو، پریشانی دور ہو جائے گی''۔

میں حیرت زدہ تھا کہ میں نے تو ابھی اپنی گزارش ہی نہیں کی، میری پریشانی شاید انہوں نے

چہرے سے پہچان لی تھی۔ اس حیرت کے دوران ہی انہوں نے فرمایا کہ "یہ تین آیات ہر وقت پڑھتے رہا کرو"۔ پریشانی رفع ہو جائے گی اور دلی سکون محسوس ہوگا۔ یہ وظیفہ کچھ عرصے تک ورد زبان رہا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میرے "موواوور" کا فیصلہ تو بہت عرصے کے بعد ہوا لیکن مجھے جو چارج شیٹ کیا گیا اس کا فیصلہ انکوائری افسر نے چند دنوں میں کر دیا اور اے ڈی پی کی پراگرس کم ہونے کا الزام رفع ہو گیا۔ صوفی صاحب نے فرمایا کہ یہ آیات کریمہ "اسم اعظم" ہیں۔ انسان کا ناطہ دنیا سے توڑ کر اس کی لو اللہ سے لگا دیتی ہیں اور پھر مشکلات کے بادل چھٹنے لگتے ہیں۔ میں ان آیات کا ورد اب بھی کرتا ہوں اور آپ کو بتانے میں کیا ہرج ہے کہ یہ آیات پڑھتے پڑھتے مجھے نیند آ جاتی ہے اور نیند میں بھیانک خواب پریشان نہیں کرتے۔ افسوس یہ ہے کہ صوفی صاحب نے خیر کبیر کی ان آیات کی تقسیم کثیر کی اجازت نہیں دی۔ صوفی برکت علی اب دنیا سے پردہ کر گئے ہیں لیکن ان کا فیض عام جاری ہے۔

میں دفتر "نوائے وقت" میں تھا تو ایک باریش منور چہرے والے بزرگ یٰسین وٹو صاحب تشریف لاتے تھے اور اپنی چہرہ شناسی، قیافہ آرائی اور دست شناسی کا ذکر افراط سے کرتے۔ کبھی کبھی ان کی پیش گوئیاں جو بالعموم سیاسی نوعیت کی ہوتی تھیں اخبارات میں بھی چھپ جاتی تھیں۔ وٹو صاحب کبھی کمرہ ادارت میں آتے اور ان کا چہرہ خوشی سے تمتماتا ہوتا تو ہم سب سمجھ جاتے کہ ان کی کسی پیشگوئی کی تعبیر ان کے ارشاد کے مطابق نکل آئی ہے اور پھر اس خوشی کا جشن برپا کرنے میں وہ دیر نہ کرتے۔ لیکن ارشاد عارف صاحب اس تعبیر کا صحافتی تجزیہ کر کے ثابت کر دیتے کہ یہ واقعہ اسی طرح ظہور میں آنا تھا اور جو کچھ ہوا ہے وہ "ان سائنٹیفک" نہیں ہے۔ لیکن یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ وٹو صاحب جس کسی کا ہاتھ پکڑ لیتے اسے اپنی حکمت کا قائل ضرور کر لیتے۔ اور اس روز تو میں حیرت زدہ رہ گیا کہ معروف سیاسی تجزیہ نگار نصرت مرزا جو اگلی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہے تھے وہ وٹو صاحب کے کرتب "سننے" کے لئے اپنا اسلام آباد کا پروگرام ملتوی کر چکے تھے۔ دفتر "نوائے وقت" سے ریٹائرمنٹ کے بعد اب میں وٹو صاحب کے کمالات سے محروم ہو گیا۔ بشکریہ نوائے وقت

مسلمانوں میں غیر اسلامی تصوف کی اشعت کے اسباب

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اسلامی تصوف ،قرآن و حدیث (سنت نبوی) سے ماخوذ ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں (۱) توحید خالص (۲) تبلیغ دین (۳) اتباع شریعت (۴) خدمت خلق (۵) جہاد

لیکن اس میں شک نہیں کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد مسلمانوں میں غیر اسلامی تصوف بھی راہ پا گیا اور یہ تصوف چوں کہ عجمی یا غیر اسلامی تھا اس لئے اس کے اجزائے ترکیبی اسلامی تصوف کی ضد تھے یعنی (۱) شرک (حلول واتحاد وانسان پرستی وتجسم وتناسخ ارواح)۔ (۲) رہبانیت (۳) تخریب دین (۴) اباحت مطعلقہ (۵) نفاق ومداہنت

یہی وجہ ہے کہ امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ سے لے کر شیخ السلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حکیم الاامت مولانا اشرف علی تھانویؒ صاحب تک ،ملت اسلامیہ کے تمام مجددین اور اولیائے امت نے اپنی پوری قوت کے ساتھ اس غیر اسلامی تصوف کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور مسلمانوں کو اس کے مفاسد سے آگاہ کر کے بلا خوف لومتہ لائم اپنا فرض منصبی انجام دیا۔

بہر کیف جس طرح بعض مسلمانوں کی گمراہی سے اسلام پر کوئی حرف نہیں آ سکتا اسی طرح بعض صوفیوں کی گمراہی سے اسلامی تصوف مورد طعن نہیں بن سکتا۔ آئندہ سطور میں ہم یہ دکھادیں گے کہ مسلمانوں میں غیر اسلامی یا عجمی تصوف کی اشاعت کے اسباب کیا تھے۔ واضح ہو کہ یہ بحث بہت تفصیل طلب ہے مگر اس کتاب میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے ہم اجمال پر اکتفاء کریں گے۔

پہلی بحث

واضح ہو کہ ابتدائے اسلام سے حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کے وسط تک مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں مسلمانوں کو حزب اللہ قرار دیا گیا ہے " یہ لوگ (جن کی صفات اوپر بیان ہو چکی ہیں) اللہ کی پارٹی یا جماعت یا فوج ہیں اور آگاہ ہو جاو کہ یقیناً اللہ ہی کی جماعت فلاح پائے گی "۔

ظاہر ہے کہ اگر کسی فوج یا جماعت میں تفرقہ پیدا ہو جائے تو اس کا خاتمہ یا مغلوب ہو کر غلام

ہو جانا اور اپنی ہستی سے محروم ہو جانا یقینی ہے۔ اس لیے از روئے عقل و نقل، مسلمانوں میں کوئی فرقہ پیدہ ہو ہی نہیں سکتا اور اسی لئے اللہ نے قرآن حکیم میں بار بار مسلمانوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ دیکھو اپنے اندر فرقہ بندی، گروہ بندی، افتراق یا پارٹی بازی کو راہ نہ دینا، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ بخوف طوالت صرف چند آیتوں پر اکتفا، کرتا ہوں۔

(ا)۔ ترجمہ۔ اے مسلمانوں! تم سب مل کر اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی سے تھام لو اور مختلف فرقوں میں منقسم مت ہو۔

(ب)۔ ترجمہ۔ اور اے مسلمانوں! ان لوگوں (یہود و نصاریٰ) کی طرح مت ہو جانا جو مختلف فرقوں میں بٹ گئے اور جنہوں نے اللہ کی طرف سے واضح دلیلیں آ جانے کے بعد بھی آپس میں اختلاف کیا (اور اس اختلاف کی وجہ سے ان میں عقائد کی خرابیاں پیدا ہو گیں)

(ج)۔ ترجمہ۔ جن لوگوں (مسلمانوں) نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کئی فرقوں میں بٹ گئے تم کو ان سے کوئی علاقہ یا سروکار نہیں ہے۔

(د)۔ ترجمہ۔ اے مسلمانوں! آپس میں نزاع (جھگڑا) مت کرو کیوں کہ نزاع سے تفرقہ پیدا ہو گا اور فرقہ بندی سے تمہارے اندر بزدلی پیدا ہو گی اور (اس کا نتیجہ یہ ہو گا) کہ تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم نہ رہو گے۔

اس آخری روایت سے فرقہ بندی کی مضرت کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوا کہ قرآن کو نازل کرنے والا مسلمانوں کو ایک متحد الخیال اور متحد المقصد فوج کے افراد قرار دیتا ہے۔ جن کے حق میں اختلاف سم قاتل سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ اسی لئے انہیں متنبہ کرتا ہے کہ دیکھنا! کہیں آپس میں نزاع کو راہ نہ دینا اور فرقوں میں منقسم نہ ہو جانا کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہاری جماعت کے اندر مختلف الخیال گروہ پیدا ہو جائیں گے اور فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم آپس میں لڑو گے اور آپس کی لڑائی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب اٹھ جائے گا، بالفاظ دیگر تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور تمہارے اندر بزدلی پیدا ہو جائے گی، اس تنبیہ کے بعد آخری نصیحت یہ فرمائی کہ دشمنوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تجربہ کار سپہ سالار اپنی فوج کے نوجوانوں کو نصیحت کر رہا ہے، فی

الجملہ اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ قرآن حکیم مسلمانوں کو اللہ کی فوج قرار دیتا ہے اور اس کی مزید تائید اس آیت سے ہوتی ہے

ترجمہ "یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں اور آگاہ ہو جاؤ کہ شیطان کے گروہ کے لوگ گھاٹے میں رہیں گے"۔

یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی رو سے اللہ کی نگاہ میں مسلمان قوم یا ملت اسلامیہ، اللہ کی فوج ہے اس آیت سے بھی ثابت ہوتی ہے

"بلاشبہ اللہ محبت کرتا ہے ان لوگوں سے جو اس کی راہ میں اس طرح صف باندھ کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں"۔

چونکہ مسلمان اللہ کی فوج ہیں اسی لئے ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ دشمنان اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاری سے غافل نہ ہوں۔

اے مسلمانوں! دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاری کرو جس قدر تم سے ممکن ہو سکے۔ یونی مادی قوت فراہم کرو اور گھوڑے باندھو (یعنی پلٹن اور رسالے تیار کرو)

اس سلسلے میں قول فیصل یہ ہے کہ اللہ نے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے۔ یعنی جس طرح دنیاوی حکومتوں میں یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک شخص فوج میں بھرتی ہوتا ہے تو اسی وقت سے وہ اپنی زندگی اور اپنی مرضی افسر فوج کے حوالے کر دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب ایک شخص کلمہ پڑھ لیتا ہے تو حزب اللہ میں داخل ہو جاتا ہے اور اسے اپنی جان اور اپنے مال پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔

"اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے (اب ان کا کام صرف یہ ہے کہ) وہ اللہ کی راہ میں لڑیں گے (جس کا نتیجہ لازمی طور سے یہ ہوگا کہ) وہ قتل کریں گے یا قتل ہو جائیں گے"۔

قرآن مجید میں اس نوعیت کی آیتیں بہت سی ہیں۔ ایضاح مقصد کے لئے اتنی ہی آیتیں کافی ہیں۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کی امتیازی صفت یہ بیان کی ہے۔

"حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ محمد ﷺ کے ساتھ ہیں ان کی شناخت

یہ ہے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں مگر آپس میں رحیم ہیں"

اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ فرقہ بندی اسلام کی ضد ہے کیونکہ فرقہ بندی کا لازمی نتیجہ آپس میں نزاع ہے۔

بلاشبہ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو خدائی فوجدار قرار دیا ہے۔یعنی ان کا کام یہ ہے کہ وہ دنیا سے برائی کو مٹائیں اور نیکی کی اشاعت کریں چنانچہ ارشاد ہوا کہ،

"اے مسلمانو تم دنیا میں بہترین جماعت ہو جو انسانوں کو نیکی کا حکم دو گے اور برائیوں سے منع کرو گے"

ظاہر ہے کہ مسلمان خود مختلف فرقوں میں منقسم ہو جائیں گے تو نہ ان میں اتحاد باقی رہے گا نہ دوسروں کی اصلاح کا جذبہ باقی رہے گا اور نہ اس کے لیے وقت مل سکے گا جو جماعت آپس میں لڑنے لگتی ہے وہ خود محتاج اصلاح ہو جاتی ہیں۔

قصہ کوتاہ قرآن کی ان صریح آیتوں سے ثابت ہو گیا کہ فرقہ بندی اسلام کی ضد ہے اور منشاء ایزدی کی عملاً تردید ہے۔ یہ آیتیں صدر اول کے مسلمانوں کے سامنے تھیں اور حضور انور ﷺ نے 23 سال کی مدت میں ان کے اندر وحدت افکار و کردار پیدا کر دی تھی۔تمام مسلمانوں کے سامنے ایک ہی مقصد تھا اور ایک ہی نصب العین تھا یعنی اعلاء کلمۃ الحق۔اللہ کے کلمے (قرآن) کو دنیا میں بلند کرنا ان کا جینا اور مرنا سب اللہ کے لئے ہی تھا۔

اللہ سے بڑھ کر انسانی فطرت کا عالم کون ہو سکتا ہے؟ انسان کی یہ فطرت ہے کہ اگر وہ شخصیت کو اپنا مقصود بنا لے اور اس کے لئے اپنی زندگی بسر کرنے لگے تو رفتہ رفتہ وہ خدا پرستی سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب غیر اللہ مطمح نظر اور مقصود حیات بن گیا تو اللہ خود دل و دماغ سے اوجھل ہو جائے گا اور شخصیت پرستی چونکہ شرک عظیم ہے اس لئے مسلمان، مسلمان نہیں رہ جائے گا بلکہ مشرک ہو جائے گا، ویسا ہی مشرک جیسا کہ عیسیٰ یا کرشن یا لات وہبل کا پرستار۔

اس لئے قرآن نے شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیا اور تاریخ مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرنے سے یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ قرآن سے بڑھ کر کسی الہامی یا آسمانی کتاب نے شخصیت پرستی کی تردید نہیں کی۔ کسی انسان کی پرستش کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ اس انسان میں الوہیت کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اسی عقیدے نے رفتہ رفتہ تجسم یا حلول یا اوتار کے عقیدے کی شکل اختیار کر لی۔ دنیا میں جن

جن انسانوں کی پرستش کی گئی ہے، پہلے ان میں الوہیت تسلیم کی گئی پھر ان کی پرستش شروع ہوئی اسی لئے قرآن نے شخصیت پرستی کا جس خوبی سے سد باب کیا ہے وہ مذاہب عالم کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔

ا۔ مسلمانوں کو حکم دیا کہ آنحضرت ﷺ کی رسالت سے پہلے آپ کی بشریت اور عبدیت کا اقرار کریں۔ **اشهدان محمد عبده ورسوله**

اس کلمہ شہادت میں عبد پہلے ہے اور رسول بعد میں ہے۔

ب۔ "اے رسولؐ آپ اعلان کر دیجئے کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک بشر ہوں"۔

ج۔ "اور حضرت محمد ﷺ نہیں ہیں مگر رسول، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو (اے مسلمانوں) کیا تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے یعنی اسلام چھوڑ دو گے؟"

اس نص صریح سے ثابت ہوا اسلام کی روح خدا پرستی ہے۔ شخصیت پرستی نہیں ہے خواہ وہ شخصیت رسول ہی کیوں نہ ہوں۔ اب یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام میں کوئی شخصیت رسول اللہ ﷺ سے ارفع نہیں ہے لیکن اللہ نے اپنے دین اسلام کو رسول ﷺ کی شخصیت سے بھی وابستہ نہیں کیا۔۔۔ تابدیگراں چہ رسد؟

اسلام کی تاریخ میں حضرت صدیق اکبرؓ کو یہ فخر حاصل ہے سب سے پہلے انہوں نے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اسلام شخصیت پرستی کا نام نہیں ہے یعنی اسلام کی مقصود و مطلوب صرف اللہ ہی ہے۔ جو **حیی لایموت** ہے۔ جب سالم بن عبید کے ذریعے حضرت ابوبکرؓ کو حادثہ رحلت سرور عالم ﷺ کی خبر پہنچی تو آں جناب فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر کاشانہ نبوت میں تشریف لائے۔ آں حضرت ﷺ کے جسد اطہر کے قریب کھڑے ہو کر رخ روشن سے چادر اٹھائی، پیشانی مبارک پر بوسہ دیا۔ گریہ کناں آپ ﷺ کو مخاطب کر کے گویا ہوئے۔

"میرے ماں باپ آپؐ پر فداء ہوں، آپؐ زندگی میں بھی پاک اور صاف تھے اور اب موت کے بعد بھی پاک اور صاف ہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اللہ آپ

کو ہر گز دو موتیں نہیں دے گا۔ وہ موت جو اللہ نے آپ کے لئے مقرر کر دی تھی، وہ تو آپ کو آ ہی گئی" یہ کہہ کر مسجد نبوی میں تشریف لائے، یہاں عجیب کہرام مچا ہوا تھا، فاروق اعظمؓ کہہ رہے تھے کہ حضور ﷺ کی وفات نہیں ہوئی ہے صدیق اکبرؓ نے انہیں سمجھایا اور کہا کہ بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گئے تو آں جناب نے تقریر شروع کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا۔

جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا وہ سن لے کہ بلا شبہ آنحضرت ﷺ وفات پا گئے، لیکن جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ بے شک اللہ زندہ ہے، جسے کبھی موت نہیں آئے گی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمد ﷺ نہیں ہیں مگر اللہ کے ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں پس اگر ان کو موت آ جائے یا وہ قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم ایڑیوں کے بل پیچھے کو لوٹ جاؤ گے؟ اسلام ترک کر دو گے؟ جو شخص ایسا کرے گا تو وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اللہ شکر کرنے والوں کو عنقریب جزاء دے گا!

یہ تقریر سن کر حاضرین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے لیکن ساتھ ہی انہیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ آخری آیت گویا انہیں معلوم ہی نہ تھی۔ اب حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کی تلاوت کی تو ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا اور یہ آیت اس قدر موثر ثابت ہوئی کہ ہر شخص اس کی تلاوت کر رہا تھا۔

خلاصہ کلام یہ کہ سرکار دو عالم ﷺ اور حضرات شیخین نے زبانی تعلیم اور طرز عمل سے یہ بنیادی حقیقت مسلمانوں کے دلوں میں جا گزیں کر دی تھی کہ فرقہ بندی اسلام کی ضد ہے اور مسلمانوں کی حیات اجتماعی کے حق میں سم قاتل ہے یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد خلافت شیخین میں کوئی فرقہ موجود نہ تھا اور اس وحدت فکر و عمل کا یہی ثمر تھا کہ مسلمانوں نے خلافت شیخیں اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں عدیم المثال کامیابی حاصل کی جس کی تفصیل تاریخ اسلام کے صفحات سے واضح ہو سکتی ہے۔ یہ کامیابی اس قدر حیرت انگیز ہے کہ آج تک بہت سے غیر مسلم مورخین کے لئے ایک عقدہ لا ینحل بنی ہوئی ہے اقبال نے اسی عقدے کو ایک شعر میں حل کیا ہے۔

وحدت افکار و کردار آفریں
تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صفات پر خلق کیا ھے؟

مسرت الغاری

قارئین تھوڑی دیر کے لئے اگر ہم پوری ایمانداری سے ایک ٹھوس احساس کے تحت یہ سوچیں کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صفات پر خلق کیا ہے؟ اسے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے؟ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کیا کیا ہیں؟ تو ہماری سوچ قرنوں تک اس حقیقت یا راز کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ شمار ناممکن کہ اس کی صفات کیا کیا ہیں؟ سوائے اور محض چندان صفات کے جن کے بارے میں ہم محض سوچ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری عقل و منطق مکمل طور پر ہار جاتی ہے۔

وہ یکساں صفات جو واضح طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ یہ ہیں:

☆ وہ خالق اول ہے لہٰذا انسان کو بھی اس نے تخلیق کرنے کی صفت ودیعت کی ہے۔

☆ وہ اپنی خلقت سے حد درجہ پیار کرتا ہے اس لئے اپنی خلقت کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پیار کریں۔

☆ وہ اپنی تخلیق کے کسی بھی ذرے سے نفرت نہیں کرتا لہٰذا انسان کو بھی کسی سے نفرت نہ کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔

☆ وہ مکمل حق ہے اس لئے انسان کو حق گوئی کی تلقین فرمائی ہے۔

☆ اس نے خود سرور کائنات رحمت للعالمین نبی پاک ﷺ سے عشق فرمایا اس لئے انسانوں کو بھی اس سے عشق کرنے کا حکم دیا اور اسی کی شفاعت سے سب کو بخشنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

☆ وہ معاف فرمانے والا ہے۔ اس لئے درگزر کرنے والوں کو عزیز رکھتا ہے۔

☆ وہ رحیم ہے۔ انسانوں کو بھی انسانوں اور جانوروں پر رحم کا حکم دیتا ہے اور قہر و ظلم کو ناپسند فرماتا ہے۔

☆ وہ نرمی اور حلم کی انتہا ہے۔ اس لئے نرم خو لوگوں کو جنت کی بشارت دیتا ہے اور انصاف کے ترازو میں خلق اعلیٰ کو بھاری ترین وزن قرار دیتا ہے۔

☆ وہ ستار اعظم ہے اس لئے لوگوں کی بھی ایک دوسرے کے لئے عیوب پوشی کو پسند فرماتا ہے۔

☆ وہ انسان کے اعمال کو نہیں نیت کو دیکھتا ہے لہٰذا انسان کی ساری قیمت بھی نیک نیتی کے

حوالے سے لگا تا ہے۔

☆ وہ ہر بندے کا دوست ہے لہٰذا مخلوق کو بھی دوستداری اور ایک دوسرے سے محبت کرنے کا حکم دیتا ہے۔ دشمنی کو ناپسند فرماتا ہے۔

☆ انسان کو خلیفۃ اللہ کا درجہ دیا ہے تو ساتھ ہی حکم دیا ہے کہ وہ خود کو اس اعزاز کا اہل ثابت کرے۔

اب ان تمام حقائق کی روشنی میں قارئین کرام سوچنا یہ ہے کہ کیا رب رحیم و کریم نے ہمیں جو جو نعمتیں اور صفات عطا فرمائی ہیں ہم نے ان کو آنکھوں سے لگا کر کبھی رب کریم کا شکر بھی ادا کیا ہے؟ خود کو ان کا اہل بھی ثابت کر سکے ہیں؟ یا پھر ان صفات اور نعمتوں کی تحصیل کے بعد ہم نے خود کو گمراہی کی راہ پر ڈال لیا ہے؟ مطمئن ہو کر راہ مستقیم سے بھٹک گئے ہیں؟

صد افسوس ہم ناشکرے انسان جو محض مٹی کی مٹھی ہیں۔ اس کو بھلا کر بزعم خود نعوذ باللہ خدا بن بیٹھے ہیں۔ دنیا کی ہر وہ برائی جسے اس کی شان نے رد فرما دیا ہم نے اپنا لی ہیں۔ اور شاید یہ سوچ لیا ہے کہ ہم دوبارہ اٹھائے نہ جائیں گے۔ ہم میں عقل کل ہونے کا مان بھر گیا ہے حالانکہ اس کے حکم کے بغیر ہم سانس تک نہیں لے سکتے ہمارا ہر عمل، ہماری ہر تخلیق اس کے کرم کے بغیر منفی، بے معنی اور ادھوری ہے۔

مثال کے طور پر خاکرسیدہ انسان، انسان کو تخلیق کرتا ہے مگر وہ تخلیق اس خالق اول کے حکم سے مٹی کا رزق ہو جاتی ہے۔ جبکہ رب العالمین اپنی کائنات اور مخلوق کو نیست فرما کر صدیوں اور قرنوں کے بعد بھی دوبارہ ہست میں لا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک ماہر کاریگر مٹی کا خوبصورت ترین کھلونا تخلیق کر سکتا ہے مگر وہ اس سے اگر ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر اس کے لئے بعینہٖ دوبارہ ایسا بنانا ممکن نہیں رہتا ہے۔ اس میں ضرور کوئی کمی بیشی رہ جاتی ہے جبکہ اکمل ذات حق کا یہ معجزہ ہے کہ وہ جب چاہے جو چاہے جیسا چاہے دوبارہ کر ڈالے۔ اے کاش انسان خود کو اس کی صفات کی عطا کا اہل ثابت کر سکے کیونکہ یہی اس کے احسانات کی شکر گزاری کی صورت ہے۔

بشکریہ نوائے وقت

قرآن حکیم کی روشنی میں سائنس کا بیان

علیم احمد

اور تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا

ترجمہ: ''اور (منکرین) کہتے ہیں کہ جب ہم (مر کر بوسیدہ) ہڈیاں اور چور چور ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہو کر اٹھیں گے؟ کہہ دو کہ (خواہ تم) پتھر ہو جاؤ یا لوہا، یا کوئی اور چیز جو تمہارے نزدیک (پتھر اور لوہے سے بھی) بڑی (سخت) ہو۔ (جھٹ کہیں گے) کہ (بھلا) ہمیں دوبارہ کون زندہ کرے گا؟ کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔ تو (تعجب سے) تمہارے آگے سر ہلائیں گے اور پوچھیں گے کہ ایسا کب ہوگا؟ کہہ دو کہ امید ہے جلد ہوگا''۔

(سورۃ بنی اسرائیل۔ آیات 49 تا 51۔ اردو ترجمہ از: مولانا فتح محمد جالندھریؒ)

اس سے پہلے کہ ہم مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں پوشیدہ سائنسی اشارے کی طرف آئیں۔ یہ ضروری ہے کہ ارضی علوم کے ایک شعبے ''رکازیات'' (Palaeontology) کے حوالے سے کچھ اہم باتیں کر لی جائیں جن کا تعلق کسی جاندار کے مرنے اور مرنے کے بعد ممکنہ طور پر قشر ارض (Crust) کی پرتوں میں محفوظ ہو جانے سے ہے۔ قدیم جانداروں کی ایسی باقیات کو رکاز (Fossil) کہا جاتا ہے۔ ارضیات کی رو سے رکاز کی جو تعریف کی جاتی ہے، وہ درج ذیل ہے:

''ان جانداروں کی باقیات جو ماضی میں زندہ تھے۔ عموماً یہ صرف ان جانداروں تک محدود ہیں جو گذشتہ برفانی عہد سے پہلے زمین پر رہا کرتے تھے۔ رکازات عام طور پر جانداروں کے اجسام یا ان کے جسمانی حصوں (کی باقیات) پر مشتمل ہوتے ہیں، تاہم ان میں ٹریس رکازات (Trace Fossil) مثلاً گھروندوں، راستوں، نقوش اور حیوانی فضلے کی رکازی باقیات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ رکازات عام طور پر معدنی (Mineralized) حالت میں ہوتے ہیں اور رسوبی چٹانوں (Sedimentary Rocks) میں پائے جاتے ہیں۔

(بحوالہ: پینگوئن انسائیکلو پیڈیا 2003۔ صفحہ 579)

رکاز کی ایک اور تعریف ملاحظہ فرمائیے، جو قدرے مختصر لیکن جامع اور تکنیکی ہے:

''کسی جاندار کی نامیاتی باقیات، نشانات (Traces) یا نقوش (Imprints) جو ارضیاتی ماضی کے کچھ وقت سے قشرارض میں محفوظ ہیں''۔
(بحوالہ: مک گراہل ڈکشنری آف سائنٹیفک اینڈ ٹیکنیکل ٹرمز۔ چھٹا ایڈیشن 2003۔ صفحہ 843)

رکازات سے بنیادی نوعیت کی واقفیت حاصل کرنے کے بعد اب ہم اس موضوع پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ اوپر بیان کردہ تعریف سے ظاہر ہے کہ رکازات کسی ایک قسم کے نہیں ہوتے، بلکہ ان کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ کوئی رکاز کس نوعیت کا ہوگا؟ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ متعلقہ جاندار کی اپنی جسمانی ساخت اور ترکیب کس طرح کی تھی، مرنے کے بعد اس کے جسد خاکی کو کس طرح کی ارضیاتی کیفیات کا سامنا کرنا پڑا اور یہ عمل کتنے عرصے تک جاری رہا۔ یہ تمام باتیں ''رکاز سازی'' (Fossilization) کے تحت زیر بحث آتی ہے۔ چلتے چلتے ہم یہ نکتہ واضح کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ماضی میں زمین پر بسنے والے 99 فیصد جانداروں کی کوئی باقیات آج ہمیں دستیاب نہیں ہیں۔ قدیم جانداروں کا جتنا رکازی ریکارڈ (Fossil Record) بھی آج ہمارے سامنے ہے وہ بمشکل تمام معدوم اور غیر معدوم پودوں اور جانوروں کے صرف ایک فیصد حصے کا احاطہ کرتا ہے۔ ان میں سے بھی بعض جاندار ایسے ہیں کہ جن کے رکازات کا صرف ایک نمونہ ہی اب تک کے رکازی ریکارڈ سے ہمیں مل سکا ہے۔

رکاز سازی کی اولین شرط یہ ہے کہ کسی جاندار کو مرنے کے فوراً بعد یا کم سے کم ممکنہ وقت کے اندر اندر ایسے حالات میسر آ جائیں کہ اس کے جسم کے کچھ حصے یا اس کے وجود سے متعلق باقیات کو زمینی ماحول کی دست برد سے محفوظ ہونے کا موقع مل جائے۔ ظاہر ہے کہ ''حفاظتی حالات'' بہت نایاب ہیں لہٰذا ماضی کے بہت کم جانداروں ہی کو رکاز کی شکل میں آنے کے مواقع میسر آ سکے ہیں۔

ایسے رکازات بہت ہی کم ہیں جن میں کسی پورے کے پورے جانور کی باقیات یعنی اس کی ہڈیاں، گوشت اور دوسری نرم بافتیں وغیرہ بھی محفوظ ہو گئی ہوں۔ قطب شمالی کے نزدیک سائبیریا

اور الاسکا کے نہایت سرد مقامات سے زمانہ قبل از تاریخ کے ہاتھی نما جانور ''میمتھ'' کے رکازات منجمد حالت میں ملے ہیں جو اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ میمتھ کے رکازات ان علاقوں کے شدید سرد غاروں اور برف کی ہزاروں سال قدیم اور دبیز تہوں سے دریافت ہوئے ہیں۔ برف کی موٹی تہہ اور شدید سرد ماحول نے مردہ میمتھ کے دیوقامت جسموں کو گلنے سڑنے سے بچائے رکھا۔

بسا اوقات مردہ جانوروں کے جسم خشک اور گرم ماحول میں بھی محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ایسا عموماً گہرے، گرم اور خشک غاروں میں ہوتا ہے جہاں گرمی کے باوجود تازہ ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔ اس طرح کی رکاز سازی میں مردہ جانوروں کی ظاہری حالت کسی ممی جیسی ہو جاتی ہے۔ ان کی مثالیں صحرائے نیواڈا کے خشک اور گرم غاروں سے ملنے والے ''سلوتھ'' نامی سست رفتار ممالیہ کے ممی نما رکازات ہیں۔

ماہرین کی رائے میں سرد اور گرم خشک حالات کے تحت بننے والے یہ رکازات بہت نازک اور ناپائیدار ہوتے ہیں، کیونکہ جیسے ہی سرد علاقے کا موسم معمول پر آئے گا یا گرم خشک علاقے کے موسم میں نمی بڑھے گی ویسے ہی یہ باقیات بھی تیزی سے گل سڑ کر ختم ہو جائیں گی۔

ان کے برعکس اگر کسی جاندار کی باقیات زیادہ لمبے عرصے تک زمین میں دفن رہیں تو ان میں ردوبدل کا قوی امکان ہوتا ہے۔ آج جو رکازی ریکارڈ ہمیں دستیاب ہے اس کا بڑا حصہ اسی طرح کے رکازات پر مشتمل ہے۔ ان رکازات کی بھی کئی اقسام ہیں جن میں قدیم درختوں کی سخت شدہ رال میں محفوظ حشرات کے رکازات **(Amber Fossil)** سے لے کر سانچہ نما **(Mold)** رکازات اور ڈھلواں **(Cast)** رکازات تک شامل ہیں۔ فی الحال ان کے تذکرے کو ہم جگہ کی تنگی اور اختصار کے تقاضے کی وجہ سے چھوڑتے ہیں اور رکاز سازی کی اس مثال پر غور کرتے ہیں جو ہمارے زیر بحث موضوع سے مطابقت رکھتی ہے۔

اکثر رکازات صحیح معنوں میں ''پتھرا'' **(Petrify)** جاتے ہیں اور پتھر جیسی حالت میں ہی دریافت بھی ہوتے ہیں۔ ان کے تشکیل پانے کا عمل بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ہوتا کچھ یوں ہے کہ جب کوئی جاندار مرنے کے بعد زمین میں دفن ہوتا ہے اور اسی دبی ہوئی حالت میں اسے لمبا عرصہ

(کئی لاکھ سال) گزر جاتا ہے تو اس دوران مٹی کی تہہ میں موجود معدنیات (جو رسوب کی شکل میں ہوتی ہیں) رفتہ رفتہ اس کے جسمانی مساموں اور کھوکھلے مقامات کے اندر سرایت کر کے جمع ہوتی رہتی ہیں۔ اگر یہ عمل ایک طویل مدت تک جاری رہے تو یہ تمام معدنیات ان کے اندر جمع ہو کر پورے جاندار کو پتھر پر مشتمل ایک رکاز میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ ارضیات کی اصطلاح میں یہ عمل سلی سفلیکیشن (Silicification) بھی کہلاتا ہے کیونکہ ایسا کوئی رکاز، مٹی (سلیکان ڈائی آکسائیڈ) کے نہایت باریک ذرات کے جمع ہو جانے کی وجہ سے بنتا ہے۔

مردہ جانداروں کے پتھرانے کی ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جسمانی اجزاء تو زیر زمین پانی اور شدید دباؤ کی وجہ سے گھل کر ختم ہو جائیں لیکن اسی دوران نرم اور سخت جسمانی بافتوں (حتیٰ کہ خلوی دیواروں اور خلوی جھلیوں تک) کی جگہ بتدریج معدنیاتی مواد کچھ اس نپے تلے انداز سے آ جائے کہ بننے والا رکاز، اصل جاندار کی ہو بہو "پتھریلی نقل" بن جائے۔ اس قبیل کے بعض ایسے رکازات بھی دریافت ہوئے ہیں جن میں مردہ جانداروں کی خردبینی جزئیات تک کی جگہ بڑی صفائی سے معدنی مواد نے لے لی ہے۔

لوہے کی کانوں کے گرد نواح سے بھی اسی طرح کے پتھرائے ہوئے رکازات ملے ہیں جن کی رنگت شوخ ہے کیونکہ ان میں لوہے (Iron) کے سالمات کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ گویا یہ رکازات لوہے کی کچ دھات (Ore) پر مشتمل ہیں۔

یہ سرسری سی معلومات حاصل ہو جانے کے بعد جب ہم ابتداء میں بیان کی گئی آیات مبارکہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت کے بیان میں رکازات اور رکاز سازی تک کی جانب بھی ایک لطیف اشارہ کیا ہے اور ہمیں یہ جتلایا ہے کہ اس ذات باری تعالیٰ کی قدرت اتنی عظیم ہے کہ وہ ہر طرح کے مردے کو زندہ کر سکتا ہے..... خواہ وہ جاندار مرنے کے بعد پتھرا گیا ہو یا ارضیاتی عوامل کی بدولت لوہے کی کچ دھات کی شکل ہی کیوں نہ اختیار کر گیا ہو۔

بشکریہ گلوبل سائنس

دعا

عبدالرؤف شاہ توحیدی

ہے کی تیرگی میں زندگی کی اک سحر کر لوں
میں تیری ذات کے انوار کو وقف نظر کر لوں

تیرا عکس تجلی میری لوح دل پہ یوں برسے
میں اپنی سوچ کے ہر سنگریزے کو گہر کر لوں

میرا جذب دروں کچھ اس طرح ذوق عمل بخشے
میں اہل شوق کی دنیا میں خود کو معتبر کر لوں

کچھ ایسی قوت خیر البیانی بخش دے مجھ کو
کہ ہر شر البیانی کے اثر کو بے اثر کر لوں

تصرف اس طرح سے ہو مجھے اپنے مقدر پر
ستارہ گر کوئی ٹوٹے تو اس کو پھر قمر کر لوں

رؤف ہر سمت اپنے جلوہ ہائے ذات ہی دیکھوں
میں چشم کور ہیں اپنی کو چشم دیدہ ور کر لوں

زندگی اور موت کا سوال

- جب ہمارا دین مکمل، ہمارا نبی ﷺ برحق اور ہمارا قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملت اسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟
- جب اللہ تعالے نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں غالب رہو گے اور یہ بھی کہ اگر اللہ تمہارا مددگار رہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ تو پھر ہم اسقدر مغلوب بے بس اور رسوا کیوں ہیں؟
- مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس بھی خوب شاندار طریقہ سے مناتے ہیں۔ ماہ محرم میں بھی کیا جوش و خروش ہوتا ہے۔ مالدار بھی بہت ہیں اور لاکھوں لوگ کوٹھیوں، کاروں اور کارخانوں کے مالک ہیں تو پھر یہ مردنی کیوں ہے اور یہ تنزل کیوں ہو رہا ہے؟
- ہر طاقتور ملک کی نظریں ہمارے ملکوں پر کیوں لگی ہیں اور ہر طرف خون مسلم اسقدر بے دردی اور ارزانی کے ساتھ کیوں بہایا جا رہا ہے؟
- نکبت و ادبار کی موجودہ حالت سے نکلنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور کونسے لائحہ عمل پر چل کر ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف



قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کرکے
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔



کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق۔
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔